اقبالیات کی تلاش

عبدالقوی دسنوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

اقبالیات کی تلاش

عبدالقوی دسنوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

© عبدالقوی دسنوی

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار: دسمبر ۱۹۸۴ء

تعداد 750

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

اُردو کے محترم محقّق

اور بُزرگ مُشفق

جناب مالک رام

کے نام

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

ترتیب

بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ	۷
حیاتِ اقبال (اُنیسویں صدی میں)	۱۱
اقبال کی نظم گوئی (۱۹۰۱ء — ۱۹۰۵ء	۴۰
اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری	۷۲
بچّوں کا اقبال	۸۷
اقبال اور بمبئی	۱۰۵
اقبال اور علی گڑھ	۱۲۰
اقبال اور پانی پت	۱۴۴
اقبال اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱۵۱
اقبال اور خواجہ حسن نظامی	۱۶۲
کتابیات	۲۰۵

بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

علامہ اقبال کی شب و روز، حیات و تخلیقات، افکار و خیالات، حادثات و واقعات اور مخلصین و معتقدین سے متعلق مختلف مضامین پر مشتمل یہ اوراق میرے گذشتہ چند برسوں کی محنت، غور و فکر اور تلاش و تجسّس کے نتائج ہیں ان میں سے چند، سیمینار کے لیے لکھے گئے، کچھ فرمایشوں پر قلمبند ہوئے اور بعض محض ذاتی دلچسپی کی وجہ سے وجود میں آئے۔ آج ان تمام مضامین کو یکجا کر کے پیش کرنے میں یہ مسرّت ہو رہی ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک قیمتی حصّہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی زندگی کے بکھرے ہوئے اہم لمحات کو سمیٹنے اور ان سے موجودہ زندگی کے لیے غور و فکر کے لمحات حاصل کرنے کی فکر میں صرف کیا ہے۔

مجھے اس دوران میں ایسا محسوس ہوا ہے کہ شاعرِ مشرق کے ساتھ تماشائی بن کر نہیں بلکہ ان کی مسرّتوں سے مسرور، احساس و جذبات سے متاثّر اور رنج و کرب سے مضطرب رہا ہوں، ان کی زندگی کے تمام ماہ و سال، روز و شب، آفات و لمحات سمٹ کر میری زندگی سے ہمکنار ہو گئے ہیں اور میں غیر مرئی صورت میں اُن کے ساتھ ساتھ رہا ہوں۔ اُن سے گرمی نرمی حاصل کرتا رہا ہوں، اور اس قُرب سے جس قدر فیض یاب ہو سکا ہوں، انھیں تحریر میں لا کر آپ کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں، اس احساس کے ساتھ کہ یہ ویسے نہیں ہیں جیسے میرے دل نے محسوس کیے اور دماغ نے قبول کیے، اس لیے کہ الفاظ انھیں پیش کرنے سے قاصر ہیں؛ حالات مطابقت نہیں کرتے۔ ماحول اب بھی پینتیس ۳۵ سال کی آزادی کے بعد وہ پیدا نہیں ہوئے جس کی آزاد ہندستان

میں توقّع تھی۔ عام حالات میں تعلیم گاہوں کا مزاج نہ اساتذہ بنانے پر قادر ہیں، نہ طلبہ قبول کرنے کے لیے فکرمند ہیں۔ بقول اقبال :

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو !
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کُہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو !

آج بڑی قلیل تعداد طلبہ اور اساتذہ کی کسوٹی پر پوری اُتر سکے گی۔ یہ سلسلہ تجسّس و تفکّر سے بے توجّہی کا کب تک قائم رہے گا، کچھ نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ ابھی حیات کا ماحول ساز گار نہیں ہے۔ ایسے ناموافق حالات میں ہم مدرسین کو مطالعہ کے لیے وقت نہیں ہے کہ سارا وقت مادّی دولت کے حصول کے لیے وقف ہے یا اثر و رسوخ کے پیدا کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے پڑھانے سے کتراتے ہیں، اکثر طلبہ بھی پڑھنے سے بیزار نظر آتے ہیں اور اپنے اساتذہ کے نقشِ قدم پر چل کر ترقّی کرنا چاہتے ہیں۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ سلسلہ اساتذہ کی بے مقصد رہبری کا اور طلبہ کے لایعنی مقاصد کے حصول کا کیا رنگ لائے گا۔

چنانچہ درسگاہوں میں علمی، ادبی، تعلیمی، تحقیقی ماحول کم یاب ہی نہیں نایاب محسوس ہونے لگا ہے۔ وہ مدرسین جو اب بھی پرانے انداز سے سوچتے، ریاضت کرتے اور پیٹ پر پتھر باندھ کر آنکھوں پر موٹی عینک چڑھا کر دو دو چار بولنے کے عادی ہیں، معتوب و مقہور اور ذلیل و خوار ہیں۔ اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسی فضا میں درسگاہوں میں پڑھنے لکھنے کے کام کو جاری رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

ان حالات میں عام طور سے اچھے اچھوں کے پانو اکھڑ چکے ہیں، سب کے سب نہ سہی ایک بڑی تعداد مادّی دولت کے حصول میں ہاتھ پانو مارتی نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شخص کس طرح بچ سکتا ہے اور سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کرنے کے بعد علمی، ادبی، اور تعلیمی کاوشوں کو پیش کر سکتا ہے۔ اس لیے عام حالات سے نگاہیں بچا کر اور عام ترغیبات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ کر جو کچھ کر سکا ہوں نہایت خاموشی سے پیش کر رہا ہوں۔

میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ باہر کے ہنگاموں سے دامن بچاتا ہوا جب میں اپنے گھر پہنچتا ہوں تو میری شریک زندگی "نجم النساء" میرے اردگرد پُرسکون زندگی فراہم کر دیتی ہیں، جس کی وجہ سے میں نہایت اطمینان کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں زیادہ سے زیادہ وقت لگا سکتا ہوں۔ اس کے ساتھ گاہے گاہے وہ میرے علمی ادبی کاموں میں تعاون بھی دیتی ہیں جس کی وجہ سے دشواریاں دور ہوتی رہتی ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ میرے بیٹے بیٹیوں نے بھی میرے اس طرح کے کام کو آگے بڑھانے میں میرا کسی نہ کسی طرح ساتھ دیا ہے، ورنہ میرے یہ کام اردو کے بہت سے دوسرے اساتذہ کے کام کی طرح طاقِ نسیاں کی زینت بن جاتے۔ مجھے اس وقت اور خوشی ہوگی جب وہ علامہ اقبال کی بلند فکری، وسعت نظری، اور باعمل نظریۂ حیات کو اپنا کر اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے کہ یہ دنیائے آب و گل خود غرضیوں کے ہاتھوں بڑی لہولہان ہے۔

میرے خاندان میں گذشتہ سال ایک فرد کا اضافہ محمد نعمان کی صورت میں ہوا ہے وہ بھی میری زندگی کے علمی ادبی کاموں کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں معاون رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عملی طور سے خاندان پروفیسر سعید رضا کے علمی، ادبی، تعلیمی انسانی اور اسلامی کاموں کو فروغ دینے میں مدد دیتے رہیں گے۔

میں اپنی اس حقیر کاوش یعنی "اقبالیات کی تلاش" کو اردو کے مایۂ ناز محقق جناب مالک رام صاحب کے نام معنون اس یقین کے ساتھ کر رہا ہوں کہ وہ اسے قبول کر کے اس بے مایہ کی عزت افزائی اور رہنمائی کرتے رہیں گے۔

محبِ محترم شاہد علی خاں سے میرے تعلقات ربع صدی سے زیادہ عرصہ سے ہیں۔ انھوں نے اس وقت سے میرے کاموں کو پسند کیا ہے اور میری دل جوئی کی ہے جب میں محض بی۔ اے کا ایک طالب تھا چنانچہ بمبئی میں تجارتی کاموں سے ہٹ کر علمی ادبی کاموں سے جس قدر وہ دلچسپی رکھتے تھے اس میں وہ مجھے بھی شریک

رکھتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے خلوص کا وہ رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں ایک بڑی نعمت تصوّر کرتا رہا ہوں اور اس کے حضور میں سر جھکا کر شکر گزاری کا اظہار کرتا ہوں کہ سب کو "شاہد بھائی" کہاں ملتے۔

اللہ بس باقی ہوس

شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال

عبدالقوی دسنوی
۲۹ر مارچ ۱۹۸۳ء

حیاتِ اقبال

انیسویں صدی میں

(وطن، اسلاف، پیدایش، تعلیم، ملازمت)

کشمیر کی سرزمین جنّت نظیر کو یہ فخر ہمیشہ رہے گا کہ اس کی آب و گل نے ایک ایسے برہمن خاندان کی پرورش کی ہے جس کو شاعرِ مشرق علاّمہ محمد اقبال کے اسلاف ہونے کا حق حاصل ہے اور جس کی وجہ سے اس خاندان اور سرزمین کا احترام اہل شرق اور غرب کی نگاہوں میں بڑھتا رہے گا۔ خود علاّمہ اقبال کو بھی اپنے کشمیری اور برہمن زادہ ہونے پہ ناز تھا جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

تنم گلے ز خیابانِ جنّتِ کشمیر — دل از حریمِ حجاز و نوائے شیراز است

اسی برہمن خاندان کے ایک فرد نے اسلام قبول کیا اور صالح نام رکھا۔ انھیں صالح نام کی اولاد میں سے ایک فرد شیخ محمد رفیق نے بعض حالات سے مجبور ہو کر کشمیر سے ہجرت اختیار کی اور سیالکوٹ کو اپنے رہنے سہنے اور زندگی گزارنے کے لیے منتخب کیا۔ یہی محمد رفیق شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال کے دادا تھے جن کے اس فیصلہ نے سیالکوٹ کو خطۂ کشمیر کا ہم پلّہ بنا دیا۔

شیخ محمد رفیق کی کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی اس لیے:

"شیخ نور محمد کے پیدا ہونے سے پہلے اور بعد میں اُن کے والدین

نے وہ تمام رسوم ادا کیں جن کو صرف جہالت اور ضعیف الاعتقادی اور بے اولاد والدین کی ایک خاص اضطرابی کیفیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ شیخ نور محمد کی پیدائش پر اُن کی ناک چھیددی گئی اور اس میں ایک چھوٹی سی نتھ پہنا دی گئی۔ گویا اپنے زعم میں قدرت کے سامنے لڑکے کو لڑکی بنا کر پیش کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لڑکپن میں کئی سال تک شیخ نور محمد اس نتھ کو پہنے پھرتے رہے اس رعایت سے ان کا عرف "نتھو" پڑ گیا۔"[1]

شیخ محمد رفیق کے بارے میں ہمارے محققین بہت زیادہ باتیں نہیں بتا سکے ہیں لیکن شیخ نور محمد[2] کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ آگے چل کر اسم با مسمّٰی ہوئے۔ خلیفہ عبدالحکیم مصنّف "فکرِ اقبال" نے ان سے ملاقات کی تھی، چنانچہ وہ ان سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"راقم الحروف کو ان کے والد ماجد شیخ نور محمد صاحب سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا، جس زمانہ میں علاّمہ اقبال انارکلی میں رہتے تھے، وہ در اصل اسم با مسمّٰی تھے۔ نورِ محمد ان کے چہرے پر مجلّٰی تھا۔ ایک محمدی کیفیت ان میں یہ بھی تھی کہ وہ بنی اُمّی کی طرح نوشت و خواند کے معاملہ میں اُمّی تھے، وہ خدا رسیدہ صوفی تھے۔"[3]

اس بات پر سب متفق ہیں کہ شیخ نور محمد نہایت عبادت گزار، خدا ترس، پرہیزگار اور صوفی منش انسان تھے اور بزرگانِ دین کی طرح، نہایت سادہ اور درویشانہ زندگی گزار رہے تھے۔ قناعت پسندی کا یہ حال تھا کہ کپڑے سی کر گزر اوقات

---

[1] روزگار فقیر (جلد اوّل)، از فقیر سیّد وحیدالدین ص ۱۹۵ - ۱۹۶

[2] شیخ نور محمد نے طویل عمر پائی۔ ان کا انتقال ۷ راگست ۱۹۳۰ء کو سیالکوٹ میں ہوا۔ روزگار فقیر جلد اول ص ۱۹۵۔

[3] فکر اقبال ص ۱۳۔

کرتے تھے۔ یا عورتوں کے برقعوں کی ٹوپیاں تیار کرتے تھے، اور اسی کی مختصر آمدنی پر گزر بسر کرتے تھے۔ ان کے بعض اس طرح کے واقعات مشہور ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم تحریر کرتے ہیں:

"علامہ اقبال نے ایک روز ہم سے فرمایا کہ والد مرحوم کو غیر معمولی روحانی مشاہدات بھی ہوتے تھے۔ فرمایا کہ والدہ مرحومہ کا بیان ہے کہ اندھیری رات تھی، کمرے میں چراغ روشن نہ تھا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ کمرہ تمام روشن ہے حالانکہ باہر نہ چاندنی تھی اور نہ چراغ تھا۔[۲]"

مولانا عبدالسلام ندوی نے "اقبال کامل" میں علامہ اقبال کی زبانی ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے ان کی اسلام سے محبّت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پاکر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتلاؤں گا۔ بالآخر انھوں نے ایک مدّت کے بعد یہ بات بتائی اور ایک دن صبح کو جب میں حسبِ دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، میرے پاس آئے اور فرمایا: "بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اُترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے"[۳]

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی اقبال کے والد کا ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اقبال نے اپنے والد کی خدا ترسی کا ایک واقعہ رموزِ بے خودی میں نہایت موثّر طریقہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے ایک سائل کو بُری طرح ڈانٹا، والد سن رہے تھے۔ انھوں نے اس درد انگیز طریقہ سے میری

---

[۱] اقبال کی تاریخ ولادت از مالک رام، تحریر، دہلی جولائی / ستمبر ۱۹۷۵ء ص ۴۳

[۲] فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۴-۱۵

[۳] اقبال کامل از عبدالسلام ندوی ص ۳-۴

اس درشتی پر سرزنش کی کہ اس کے بعد سے آج تک میں کبھی کسی سائل کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی نہیں برت سکتا۔"[1]

یا علامہ اقبال اسکاچ مشن کالج میں داخلہ لینے گئے تو اُن کے والد نے اُن سے عہد لیا:

"تم تعلیمی زندگی میں کامیاب ہونے کے بعد اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دو گے۔"[2]

ان تمام واقعات سے علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کی بزرگی، درویشی، خدا ترسی، حق شناسی، انسان دوستی اور اسلام سے والہانہ محبت کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے اپنی عبادت، ریاضت اور صوفیانہ طبیعت ہی کی وجہ سے عارفانہ زندگی کے ایک خاص کمال کے درجہ کو پالیا تھا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ایک شب خواب میں دیکھا:

"پہلی ہی ملاقات میں شیخ نور محمد صاحب نے اقبال کی پیدائش کا ایک دلچسپ قصہ مجھ سے بیان کیا۔ فرمانے لگے کہ اقبال ابھی ماں کے پیٹ میں تھا کہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوشنما پرندہ سطحِ زمین سے تھوڑی بلندی پر اُڑ رہا ہے اور بہت سے لوگ ہاتھ اٹھا کر اور اچھل اچھل کر اس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ کسی کی گرفت میں نہیں آیا۔ میں بھی ان تماشائیوں میں کھڑا تھا اور خواہش مند تھا کہ غیر معمولی جمال کا یہ پرندہ میرے ہی ہاتھ آجائے، وہ پرندہ یک بیک میرے آغوش میں آگرا، میں بہت خوش ہوا اور دوسرے منّہ تکتے رہ گئے، اس کے کچھ عرصے بعد مجھے اس خواب کی تعبیر القا ہوئی کہ پرندہ عالم روحانی میں میرا پیدا ہونے والا بچہ ہے جو صاحب اقبال ہوگا۔"[3]

شیخ نور محمد صاحب کے گھر اور خاندان میں اسی طرح کی مذہبی، درویشانہ اور صوفیانہ

---

[1] تلمیحات و اشارات اقبال از اکبر حسین قریشی ص ۱۴۔

[2] تلمیحات و اشارات اقبال از اکبر حسین قریشی ص ۱۵۔

[3] فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۴۔

زندگی، اور عقائد اور خیالات تھے۔ مندرجہ بالا واقعات سے ان کے افکار اور ذہنی رَو کا پتا چلتا ہے۔ اسی فضا اور ماحول میں جس میں یہ خاندان پروان چڑھ رہا تھا۔ علامہ اقبال ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء[لہ] کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے گھر کے عارفانہ مزاج کے متعلق ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جس گھر کا مگر چراغ ہے تُو ہے اس کا مذاق عارفانہ

علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی بھی نیک طبیعت، عبادت گزار، پرہیزگار اور سادہ مزاج تھیں۔ علامہ کی تربیت، دیکھ ریکھ اور ذہنی نشو ونما میں ان کی پاکیزہ زندگی اور حسن سیرت کا بڑا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اس کا اعتراف جس طرح سے علامہ اقبال نے اپنی والدہ کی وفات (۹ر نومبر ۱۹۱۴ء عمر ۸۷ سال) پر اپنی طویل اور عظیم نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں کیا ہے اردو میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نظم کا ہر شعر علامہ اقبال کے سچے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، چند شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں تاکہ اقبال اور ان کی والدہ دونوں کو سمجھنے میں مدد ملے، مرحومہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

لہ اب تک علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ مختلف تحریروں میں مختلف تاریخیں درج ہیں ملاحظہ کیجیے۔

(۱) شیخ محمد اقبال ایم۔ اے سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور آپ کی ولادت ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔

(۲) علامہ اقبال کی ولادت ۲۴ر ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی۔

(عبدالمجید سالک۔ ذکر اقبال ص ۱۔ نذیر احمد کلید اقبال ص ۱۷)

(۳) علم وادب کا یہ درخشندہ ستارہ ۱۸۷۳ء میں آسمان سیالکوٹ میں جلوہ گر ہوا۔

(یادگار اقبال مرتبہ سید محمد طفیل احمد بدر امروہوی ص ۱۸)

(۴) "اقبال" اصلاً کشمیری برہمن تھے یعنی خالص آریائی نژاد۔ ان کی ولادت ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء ہے۔ (سید عابد علی عابد۔ شعر اقبال ص ۶۵)

(۵) اقبال ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اس وقت پنجاب میں انگریز کی حکومت نئی نئی تھی۔

عنایت اللہ۔ حیاتِ اقبال (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزّت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبّت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

دامِ سیمینِ تخیّل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا !
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا !

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے !

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(۶) لیکن ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تاریخ بھی جو سالک نے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر سے دیکھ کر لکھی تھی ٹھیک نہیں۔ صحیح تاریخ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے جو اس کے بعد ہی دوسرے لڑکے کی تاریخ ولادت ہے۔ (مالک رام۔ اقبال کی تاریخ ولادت تحریر دہلی جولائی ستمبر ۱۹۷۵ء ص ۴۵)

(۷) ..... سچ یہی ہے کہ جسٹس کمیٹی کا ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی بنیاد پر دسمبر ۱۸۷۲ء سے جشن صد سالہ اقبال کے طور پر سال ولادت منانے کا پروگرام ہی درست تھا۔
(ڈاکٹر نظیر صوفی۔ علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت کیا ہے؟ تحریر جولائی ستمبر ۷۵، ص ۵۸)

(۸) BORN IN SIALKOT ON 22ND FEBRUARY, 1973. IQBAL was EDUCATED AT MURRAY COLLEGE SIALKOT AND GOVT. COLLEGE LAHORE.
(Mohamad Sadique - A History of Urdu Literature P.357)

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

محمد اقبال کو علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال تک پہنچنے میں ان کے گھر کے اس ماحول نے بڑا کام کیا، پھر تعلیمی راہ میں گہرا نقش جس استاد نے چھوڑا اور علامہ اقبال کی تعمیر میں حصّہ لیا وہ بھی اسی طبیعت اور اندازِ فکر کے مالک تھے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم سے ہی وہ اس راہ پر مضبوطی سے چل نکلے۔ جب ذرا بڑے ہوئے اور مکتب میں بیٹھنے کے لائق سمجھے گئے تو عام مسلمان بچوں کی طرح ان کی بھی مکتبی تعلیم شروع ہوئی۔ پہلے استاد غلام حسین[1] تھے جو سیالکوٹ کے محلہ شوالہ کی مسجد میں خطیب اور امام تھے مولوی وحیدالدین فقیر بیان کرتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

IQBAL WAS BORN AT SIALKOT IN THE PUNJAB ON FEBRUARY 22, (9)
1873* (SAYED ABDUL WAHID-IQBAL HIS ART AND THOUGHT - PAGE 3)

(۱۰) اقبال ۱۸۷۵ء میں بمقام سیالکوٹ اپنے خوش نصیب والدین کے یہاں پیدا ہوئے۔
(کشمیری میگزین اپریل ۱۹۰۹ء، انوار اقبال مرتب بشیر احمد ڈار ص ۷۹۔۸۰)

(۱۱) اللہ نے اس کام کے لیے (اقبال کو ہندستان میں ۱۸۷۵ء) میں پیدا کیا۔
(محمد حسین بی۔ اے۔ جامعہ، اقبال کا نام اور کام۔ یاد اقبال مرتبہ چودھری غلام سرور فگار)

(۱۲) تقویم عیسوی کا ایک ہزار آٹھ سو پچھترواں سال تھا کہ مردم خیز خطۂ پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں اقبال کی ولادت ہوئی۔ (محمد عبدالرزاق علیگ۔ دیباچہ کلیات اقبال مطبوعہ ۱۳۴۳ھ)

(۱۳) اقبال سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد نے کشمیر سے آکر بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ان کی ولادت ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ (عبدالقادر سروری۔ جدید شاعری ص ۱۵۷)

(۱۴) سال ولادت ۱۸۷۵ء اور مقام ولادت سیالکوٹ ملک پنجاب ہے۔
(رام بابو سکسینہ ڈاکٹر اقبال ضمیمہ تاریخ ادب اردو ص ۱۸۶ ترجمہ عسکری)

(۱۵) ڈاکٹر صاحب (اقبال) اسی سال سیالکوٹ میں ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے (عبدالسلام ندوی، اقبال کامل ص ۴)

(۱۶) سر شیخ محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ (سید بہاء الدین احمد۔ گلستان ہزار رنگ ص ۵۱۶)

(۱۷) آپ ۱۸۷۶ء بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے (منشی محمد دین فوق۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نیرنگ خیال، اقبال نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۲۵) (حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] روزگار فقیر حصہ اوّل ص ۲۱۰

"ایک دن مولوی میر حسن صاحب مولوی غلام حسین سے ملنے کے لیے گئے۔ غلام حسین صاحب مکتب میں بچّوں کو پڑھا رہے تھے۔

مولوی میر حسن کی نظر اقبال پر پڑی اور پہلی نگاہ ہی میں انھوں نے محسوس کیا:

بالائے سرش زہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی

مولوی غلام حسین سے انھوں نے پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے، اس کا کیا نام ہے؟ مولوی غلام حسین نے جواب دیا: یہ شیخ نور محمد کا لڑکا محمد اقبال ہے۔ اس واقعہ کے ایک دو دن بعد مولوی میر حسن کی ملاقات شیخ نور محمد سے ہوئی، انھوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ آپ اپنے لڑکے کو شوالہ کے مکتب میں پڑھنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ اب اسے آپ میرے پاس بھیجیں میں اسے پڑھاؤں گا۔

شیخ نور محمد مولوی صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے چنانچہ انھوں نے اقبال کو مولوی غلام حسین کے یہاں سے اُٹھالیا۔ شوالہ کے مکتب میں جانا موقوف ہوگیا اور اب وہ مولوی میر حسن[1] کے یہاں پڑھنے کے لیے جانے لگے"۔

عمر کا یہ وہ زمانہ تھا جس میں اقبال کو بٹیریں اور کبوتر پالنے کا بہت شوق تھا اور اکھاڑے میں ورزش سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے یہ تمام شوق اس وقت بھی قائم رہے جب وہ مولانا میر حسن کے یہاں مکتبی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں:

---

[1] عبدالمجید سالک لکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال انھیں بچّوں میں سے تھے جن کو مولانا سیّد میر حسن شاہ جیسا مجمع البحرین استاد مل گیا اور اسی استاد نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنا دیا۔" (ذکر اقبال ص ۲۷۳)

مولانا سید میر حسن شاہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے روشن خیال عالم تھے اسی وجہ سے سرسید سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے چنانچہ اس تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے شیخ آفتاب احمد لکھتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

"بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے، کبوتر اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا، مولانا میر حسن کے صاحبزادے سیّد محمد نقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا، کم بخت اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے۔ لال پہلوان (لالو) جو اقبال کے بچپن کے دوست ہیں ان کی کبوتر بازی کے قصّے سناتے ہیں"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

"سرسید مرحوم سے پہلی مرتبہ ملاقات ۱۸۷۷ء میں ہوئی، دونوں کے تعلقات دوستانہ قائم ہوگئے جو اوّل الذکر کے سفرِ آخرت اختیار کرنے تک قائم رہے۔ سرسیّد کی زندگی میں اس کے بعد کوئی سال ایسا نہ تھا کہ مولوی صاحب مرحوم سرسیّد مغفور کی دعوت پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شریک نہ ہوئے ہوں، سیّد کے اس دعوے "دِلے بریاں زعشق مصطفےٰ دارم" کا بہترین ثبوت وہ واقعہ ہے جس کے مولوی صاحب مرحوم عینی شاہد تھے۔ سرسیّد مرحوم کی زندگی کے آخری دن تھے۔ مولوی صاحب کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے علی گڑھ میں تشریف فرما تھے۔ رات کو دیر تک کسی اہم مسئلہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور پھر دونوں بزرگ سوگئے۔ آدھی رات کے وقت مولوی صاحب کی آنکھ کھلی تو سرسیّد والے پلنگ کو خالی پایا۔ مولوی صاحب کو کچھ تردّد ہوا، باہر نکل کر دیکھا سرسیّد برآمدے کے ایک کونے میں کھڑے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے تھے کہ خدا ان کی قوم کو گمراہی سے بچائے اور ترقّی کی طرف لائے، اس نیک مرد کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سرسید کے اس اخلاص کا مرحوم پر اس قدر اثر ہوا کہ تادم مرگ ان کے مدّاح رہے، سرسیّد کی وفات کے بعد ان کی سالگرہ کے دن "حیات جاوید" کا مطالعہ کیا کرتے اور یہ طریقہ سال وفات تک جاری رہا۔"

(شیخ آفتاب احمد علاّمہ سر اقبال کے استاد۔ نیرنگ خیال۔ اقبال نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء ص ۷۲)

حاشیہ صفحہ ہذا [1] ذکر اقبال از عبدالمجید سالک ص ۱)

مولانا میر حسن کی تعلیم کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ عام روش سے ہٹ کر درس اس طرح دینا چاہتے تھے کہ طالب علم کو زبان و ادب سے دلچسپی پیدا ہو اور وہ اس زبان و ادب کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہو۔ چنانچہ سید عابد علی عابد تحریر کرتے ہیں:

"۔۔۔۔ میر حسن شاہ نے جب اقبال کو گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، انوار سہیلی اور ظہوری کی تصانیف پڑھائیں تو رسمی انداز تدریس سے قطع نظر کر کے یہ کوشش کی کہ اقبال کے دل میں فارسی ادب کا احترام پیدا ہو جائے اور نتیجتاً اس ذوق سلیم کی تربیت ہو جس کے بغیر مطالعہ بالکل بیکار اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔ [1]

اقبال مولانا میر حسن شاہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے لیکن کبھی کبھی مولانا غلام حسین کے یہاں بھی چلے جاتے تھے۔ پھر میر حسن شاہ ہی کی خواہش سے اقبال کے والد نے ان کا داخلہ اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ میں کرا دیا جہاں شاہ صاحب بعد میں خود مدرس ہو گئے تھے، یہاں اقبال نے ان سے دینی تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور مدرسہ کی تعلیم میں بھی پیش پیش رہے۔ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں پرائمری، ۱۸۹۰ء میں مڈل اور ۱۸۹۲ء [2] میں انٹرنس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور وظیفہ کے حقدار ہوئے۔ اسی دوران میں اس اسکول میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم بھی شروع ہو گئی، اس کا نام اسکاچ مشن کالج پڑ گیا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے ایف اے کی تعلیم یہیں حاصل کی اور امتحان میں کامیابی کے بعد لاہور چلے آئے، اس لیے کہ اس وقت تک اسکاچ مشن کالج میں بی۔ اے کے کلاسیز نہیں کھلے تھے، یہاں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔

سیالکوٹ کے زمانۂ قیام میں اقبال نے میر حسن شاہ سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ہر طرح سے ان سے فیض اٹھاتے رہے۔ دراصل مولانا میر حسن شاہ عربی فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم تھے، اسلامیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ادبیات، لسانیات

---

[1] شعر اقبال از عابد علی عابد ص ۶۶۔ [2] روزگار فقیر میں ۱۸۹۳ء درج ہے۔

ریاضیات اور تفسیر قرآن کے بھی بڑے ماہر[1] تھے ۔ وہ عام مذہبی لوگوں کی طرح خشک مزاج نہ تھے بلکہ اس قدر خوش مزاج، مجسم اخلاق اور وسیع قلب و نظر کے مالک تھے کہ دوسرے مذاہب کے طلبہ اور اساتذہ بھی ان سے متاثر رہتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے ۔ ان کی زندگی ان کے لیے پرکشش تھی فارسی اور اردو کے بے شمار شعر زبان پر رہتے تھے جس کا عام اثر یہ ہوتا تھا کہ جو طالب علم ان کے قریب آتے تھے ان میں بھی اردو فارسی کا وہی ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علامہ اقبال بھی متاثر ہوئے، انھیں بھی اپنے استاد کی طرح فارسی کے سیکڑوں شعر یاد ہو گئے تھے۔ انھوں نے علامہ اقبال کو عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ علمِ حکمت اور تصوّف سے بھی روشناس کرایا اور اسلامیات سے ایسی رغبت پیدا کر دی کہ پھر ساری زندگی اس کی محبت میں سرشار رہے۔ مولانا میر حسن درسی تعلیم سے ہٹ کر طلبہ کو اس انداز سے تربیت دیتے تھے کہ عملی زندگی میں وہ حیات اور اس کے رازہائے سربستہ کو سمجھ سکیں ، کامیابی کے ساتھ اسے برت سکیں اور اعتماد و یقین کے ساتھ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کر سکیں۔ چنانچہ علامہ اقبال بھی ان کی تعلیم اور تربیت سے اچھی طرح فیض یاب ہوئے جس کا احساس خود علامہ اقبال کو ہمیشہ رہا۔ وہ "ساری زندگی اپنے استاد کی شفقت، محبت، قابلیت اور نیک نفسی کی تعریف کرتے رہے"[2]

سیّد عبداللہ سے ڈاکٹر اقبال کا یہ کہنا:

"عبداللہ جی یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم یا فلسفی نہیں ہے ORIENTAL AND OCCIDENTAL مستشرق یا مستغرب جس سے میں نہ ملا ہوں، یا کسی نہ کسی موضوع پر بے جھجک بات نہ کی ہو، لیکن نہ جانے کیا بات ہے شاہ جی (میر حسن شاہ) سے بات کرتے ہوئے میری قوّتِ گویائی جواب دے جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے کسی بھی نقطۂ نظر سے مجھے اختلاف ہوتا ہے لیکن دل کی یہ بات بہ آسانی زبان پر لا نہیں سکتا۔"

---

[1] ذکرِ اقبال ص ۲۴۷ [2] روزگارِ فقیر جلد اول ص ۲۰۴۔

بھی اسی کی مثال ہے جس سے استاد اور شاگرد دونوں کے تعلق اور اعلا صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "التجائے مسافر" میں بھی اپنے استاد سے متعلق نہایت عقیدت اور احترام کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ؎

وہ شمع بارگہہ خاندان مرتضوی — رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ ہے کہ خداوند آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

ایک اور جگہ اپنے محترم استاد سے فیض اٹھانے کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں ؎

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

یہ استاد کے لیے عقیدت، محبت اور احترام کا جذبہ ہی تھا کہ جب گورنر پنجاب میکلیگن نے علامہ سے دریافت کیا:

"۔۔۔۔ آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلمائ کے خطاب کے لیے موزوں ہے؟"

تو علامہ اقبال نے جواب دیا۔

"میں ایک شرط پر نام پیش کرنے کو تیار ہوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے۔"

میکلیگن نے کسی قدر تامل کے بعد شرط قبول کر لی۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ میرے نزدیک مولوی میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے بہترین مستحق ہیں۔"

میکلیگن نے کہا:

"میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے انھوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں؟"

علامہ نے فرمایا:

"انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں وہ استاد محترم ہیں"[1]

---

[1] ذکر اقبال ص ۱۱۹۔

اس واقعہ کو شیخ آفتاب احمد اپنے مضمون "علامہ سر محمد اقبال کے استاذ" مطبوعہ نیرنگ خیال اقبال نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"گورنمنٹ کی جوہر شناسی کہیے یا مصالح ملکی کا تقاضا سمجھیے کہ جہیں سائی یا ناصیہ فرسائی کا کوئی خراج وصول کیے بغیر ڈاکٹر اقبال کو سر اقبال بنا دینے کی ٹھانی، گورنر پنجاب نے اس عنایت خسروانہ کے ایما کا اظہار فرمایا۔ اقبال نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ مگر ساتھ ہی ایک شرط بھی پیش کر دی کہ مجھے یہ خطاب بسر و چشم منظور ہے مگر اس شرط پر کہ میرے استاد کو شمس العلماء بنا دیا جائے۔" (صفحہ ۷۵)

استاد[1] محترم سے جو علامہ کا گہرا لگاؤ تھا وہ اسی شدت کے ساتھ ان کی وفات (۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء) تک قائم رہا۔ زمانہ قیام لاہور میں جب بھی ضرورت ہوئی وہ ان سے اصلاح و مشورے لیتے رہے۔ "رموز[2] بے خودی" کے بعض اشعار کے سلسلے میں اقبال نے دوسروں کے علاوہ اپنے استاد میر حسن سے بھی مشورہ حاصل کیا تھا جس کا اعتراف اس کتاب کے دیباچہ میں علامہ نے اس طرح کیا ہے:

---

[1] میر حسن شاہ بھی مرتے دم تک اپنے عزیز شاگرد سے والہانہ شفقت برتتے تھے چنانچہ اس سلسلے میں شیخ آفتاب احمد رقم طراز ہیں:

"شاگرد کی قابلیت نے استاد کے دل میں وہ گھر کر رکھا تھا کہ مولوی صاحب مرحوم اپنے نزدیک ترین عزیزوں سے علامہ اقبال کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس زمانے میں کہ مولوی صاحب بصارت سے محروم اپنی دنیا کو ایک چارپائی کی وسعت تک محدود پاتے تھے۔ علامہ اقبال ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر دہلی علاج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس حالات میں کہ استاد خود مرض الموت کے پنجے میں گرفتار ہو رہے تھے، شاگرد کی علالت کی اس قدر تشویش تھی کہ ایک آدمی کا یہ فرض قرار دے رکھا تھا کہ وہ اسٹیشن جا کر "انقلاب" خرید کر لاتا اور مولوی صاحب کو علامہ اقبال کی علالت کے متعلق تاریں پڑھ کر سنایا کرتا۔" (نیرنگ خیال، اقبال نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۷۵)

[2] رموز بے خودی طبع اول ۱۹۱۵ء

"استاذی حضرت قبلہ مولانا مولوی سید میر حسن صاحب دام فیضہم پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اور مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعر خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ، واجلالہ میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان دونوں بزرگوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرز بیانی کے متعلق قابل قدر مشورہ ملا۔"[1]

۱۸۹۵ء میں لاہور پہنچ کر علامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۷ء میں امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرکے وظیفہ کے مستحق قرار دیے گئے۔ عربی اور انگریزی دونوں مضامین میں اوّل آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے کے حقدار ہوئے۔ علامہ اقبال نے جس زمانے میں بی۔ اے میں داخلہ لیا اسی زمانے (۱۸۹۵ء) میں فلسفہ کے مشہور پروفیسر آرنلڈ علی گڑھ سے علاحدگی اختیار کرکے گورنمنٹ کالج لاہور چلے آئے تھے جہاں وہ فلسفہ کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے لگے تھے چنانچہ علامہ اقبال کو فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ایک مشہور عالم استاد سے ملا۔ ان کی تعلیم نے اقبال کے ذہن و دماغ کو خوب خوب جلا بخشی اور ان میں فلسفہ کا اچھا اور صاف ستھرا ذوق پیدا کر دیا۔ خود علامہ اقبال ذہین تھے اور سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک تھے اس لیے پروفیسر آرنلڈ ان کی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان سے دوستانہ سلوک شروع کر دیا۔ وہ اپنے دوستوں سے یہ کہتے ہوئے اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے:

"ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔"[2]

۱۸۹۹ء میں علامہ ایم۔ اے کے امتحان میں شریک ہوئے اور شاندار کامیابی حاصل کی، وہ ساری یونی ورسٹی میں اوّل آئے اور طلائی تمغہ ان کے حصے میں آیا۔ اختتام تعلیم کے بعد ہی انھیں اورینٹل کالج لاہور میں بحیثیت لکچرار جگہ مل گئی۔ جہاں وہ فلسفہ، تاریخ اور سیاست مُدن پڑھانے لگے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور جس میں وہ طالب علم کی زندگی گزار چکے تھے استاد کی ذمہ داری قبول کی اور فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ کامیابی کی اس اعلا منزل تک

---

[1] مضامین اقبال ص ۵۵ [2] ذکر اقبال ص ۱۷۔

پہنچانے میں جہاں میر حسن شاہ کے درس نے بڑا کام کیا، وہاں آرنلڈ کی تعلیم نے نمایاں حصہ لیا۔ جس کو علامہ اقبال خود محسوس کرتے رہے اور جس کا اعتراف مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں سے کرتے رہے چنانچہ ۱۹۰۴ء میں جب آرنلڈ[1] ولایت چلے گئے تو علامہ اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ کی یاد میں اپنی مشہور نظم "نالۂ فراق" کہی جس کے مطالعہ سے اقبال کے آرنلڈ سے گہرے تعلقات کا ہی پتا نہیں چلتا بلکہ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ علامہ کی علمی تشنگی خود انھیں مضطرب رکھتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہاں سے نکل کر دیارِ مغرب میں اس پیاس کو بجھائیں۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ کیجیے:

ہو گئی رخصت مسرت غم مرا ہمدم ہوا — دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا
کچھ عجب اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا — دل مرا منّت پذیرِ نالۂ پیہم ہوا

حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دہدہا باز است لیک از راہ گوشم دیدہ اند

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا — آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا — آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

ابر رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے ہر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اور ....

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو — توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو — کیا تسلّی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟

"تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

کلیات اقبال مرتبہ: عبدالرزاق ص۶

---

[1] آرنلڈ ولایت میں انڈیا آفس لائبریری کے لائبریرین مقرر ہوئے پھر لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی (شرح بانگ درا از مہر ص ۷۰)

اس نظم کے ساتھ اقبال کا یہ نوٹ بھی شائع ہوا ہے جس سے اقبال کے آرنلڈ سے گہرے تعلق پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

"استاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکونِ قلب کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، ایک دن زورِ تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آگئے۔"

علامہ اقبال کی زندگی کے تقریباً تیئس ۲۳ سے تیس ۳۰ سال اُنیسویں صدی کے حصے میں آئے تھے اس دوران میں وہ شریف النفس ماں کی آغوش میں، صوفی منش باپ کی نگرانی میں، میر حسن شاہ جیسے عالم فاضل کی تعلیم و تربیت میں اور پروفیسر آرنلڈ کی بصارت اور بصیرت کے درمیان پروان چڑھے اور علم و ادب کی دولت سے مالا مال ہوئے اور اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں سے آگاہ کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے کی راہ سے گزر کر تعلیم دینے کی ذمہ داری قبول کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور ذکاوت سے ایک استاد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا، اور دوسرے استاد کو مشفق دوست بنا لیا۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے یونی ورسٹی امتحان میں شاندار کامرانیاں حاصل کیں اور ایک زمانہ کو اپنی طرف رجوع کر لیا لیکن پھر بھی علم کی پیاس شدت سے محسوس کرتے رہے، وہ اسے بجھانے کے لیے یورپ کا سفر اختیار کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "نالۂ فراق" میں بے اختیار ان کی زبان پر آگیا ؏

توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

شاعری

علامہ اقبال کی بہت ابتدائی عمر کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا ہے، کب سے انھوں نے شاعری شروع کی، اس کے بارے میں محققین خاموش ہیں۔ البتہ ان کی بھاوج اہلیہ شیخ عطا محمد کے اس بیان سے اس کا علم ہوتا ہے، کہ بہت کم سنی سے علامہ اقبال کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی وہ بتاتی ہیں:

"اقبال بہت چھوٹی ہی عمر میں بے حد ذہین تھے اور شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی بارہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت ازار بند بنا کرتی تھی اور اقبال بازار سے منظوم قصے لاکر ہمیں لحن سے سنایا کرتے تھے ان کی آواز بہت شیریں تھی[1]"

اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ ابھی سیالکوٹ کے اسکول ہی میں تعلیم پا رہے تھے کہ انھیں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ پہلے انھوں نے اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری شروع کی تھی لیکن بدقسمتی سے اس دور کی شاعری کے نمونے محفوظ نہیں رکھے جا سکے یا اب تک حاصل نہیں کیے جا سکے ہیں۔ بعد میں شمس العلماء میر حسن کی رہنمائی میں اردو میں شعر کہنے لگے۔ چنانچہ اس زمانے کی حسب ذیل چار غزلیں اب تک دستیاب ہو سکی ہیں۔ جن میں یہ تین غزلیں:

۱۔ آب تیغ یار تھوڑا سا نہ لے کر رکھ دیا — باغ جنت میں خدا نے آب کوثر رکھ دیا
۲۔ کیا مزہ بلبل کو آیا شیوۂ بیداد میں — ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑ اڑ کے جو گھر صیاد کا
۳۔ جان دے کر تمھیں جینے کی دعا دیتے ہیں — پھر بھی کہتے ہو کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں

گلدستہ "زبان" دہلی کے ستمبر ۱۸۹۳ء نومبر ۱۸۹۳ء فروری ۱۸۹۴ء کے شماروں میں شائع ہوئی ہیں اور چوتھی غزل:

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے — یہ صدقہ ہوگی میرے سوالِ وصال کے

۱۸۹۴ء کی ہے لیکن "خدنگ نظر" لکھنؤ ماہ مئی ۱۹۰۲ء میں جگہ پا سکی ہے۔ گویا یہ چار غزلیں اس وقت کی ہیں جب علامہ کی عمر مشکل سے ۱۶ یا ۱۷ سال کی ہوگی[2]

یہ غزلیں اس زمانہ کے عام مذاق اور مزاج کی ترجمان ہیں ان میں سے پہلی تین غزلیں اس زمانے کے مشہور "گلدستہ" میں شائع ہوئی ہیں اس کے باوجود اقبال کی طرف لوگوں کی نگاہیں نہیں اٹھیں حالانکہ اس زمانے کے مشاعروں میں بھی اقبال نے شرکت کی، وجہ صاف ظاہر ہے اس وقت ان کی شاعری میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو لوگوں کو اپنی

---

[1] ذکر اقبال ص ۱۱ [2] اگر سالِ ولادت ۱۸۷۷ء کو درست مان لیا جائے۔ دسنوی

طرف متوجہ کرتی۔ وہی عام اور فرسودہ خیالات، بے لطف، بے مزہ لیکن جب چوتھی غزل اپنے ساتھیوں کے کہنے پر لاہور کے ایک مشاعرے میں انھوں نے پہلی بار پڑھی تو تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس مشاعرے میں شاہ زادہ ارشد گورگانی[1] بھی موجود تھے، اقبال نے جب یہ شعر پڑھا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو مرزا ارشد تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے کہا "اقبال! اس عمر میں یہ شعر!" یہ پہلا موقع تھا۔ جب اہل لاہور کی نگاہیں اقبال کی طرف اٹھنے لگی تھیں اور ادب شناس حضرات اقبال شناس ہونے لگے تھے۔ اسی زمانے سے شیخ عبدالقادر کے ساتھ اقبال کے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے اور بڑھنے لگے اور مرزا جلال الدین، مولوی احمد دین، خواجہ رحیم بخش، وجاہت جھنجھانوی، غلام قادر گرامی، خلیفہ نظام الدین، جالب دہلوی، آغا شاعر قزلباش، سید غلام بھیک نیرنگ، احمد حسین خاں اور محمد دین فوق سے بھی تعلقات استوار[2] ہوئے اور بعض حضرات کے لکھنے کے مطابق علامہ اقبال نے ارشد گورگانی سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لی[3]۔ لیکن اس سے پہلے دوران قیام سیالکوٹ ہی میں اقبال نے خط و کتابت کے ذریعہ داغ سے اپنے کلام پر اصلاح لینی شروع کر دی تھی۔ داغ اس زمانے میں حیدرآباد سے وابستہ ہو چکے تھے اور ان کی شہرت اور مقبولیت سارے ہندستان

---

[1] اُنیسویں صدی کے اخیر سے پہلے دہلی کی تیموری شمع گل ہو چکی تھی۔ صاحب عالم مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی دودمان مغلیہ کی چند یادگاروں میں سے ایک صاحب علم و فضل ہنوز باقی تھے۔ لیکن دود چراغ کشتہ یعنی اپنے خانوادہ کی طرح اجنبی فضا میں پریشان تھے۔ انھوں نے کسب معاش کی خاطر لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ وہ تصنیف و تالیف، برجستہ اور شعر و سخن کا فکر بے ساختہ کیا کرتے تھے۔ ان کا شمار اساتذۂ فن اور مشاہیر وقت میں ہوتا تھا۔ (کلیات اقبال ص ۳۲) ۵۸ برس کی عمر میں ۲۱ فروری ۱۹۰۶ء کو اچانک اس دار فانی سے ملک جاودانی کو سدھارے۔ (رخم خانہ جاوید جلد اول صفحہ ۲۶۷) [2] شعر اقبال از عابد علی عابد ص ۷۷ [3] محمد اقبال صاحب نے بھی آپ کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا ہے (... خمخانہ جاوید جلد اول ص ۲۶۔)

میں تھی، لیکن داغ سے شاگردی کا سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ غالباً ۱۹۰۰ء کے ساتھ ختم ہو گیا اس لیے کہ :

"داغ نے ان کی چند غزلوں کی اصلاح کے بعد لکھ بھیجا کہ اب تمھارے کلام کو اصلاح کی ضرورت نہیں[1]"

لیکن بقول سر عبدالقادر :

"البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی، داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی[2]"

فروری ۱۸۹۶ء میں علامہ اقبال نے ایک نظم "فلاح قوم" یا "ترقی و تعلیم" کہی جو ذیل کے نوٹ کے ساتھ کشمیری میگزین لاہور بابت مارچ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔

"یہ نظم[3] ڈاکٹر اقبال نے فروری ۱۸۹۶ء میں سب سے پہلی مجلس کشمیری[4] مسلمانان لاہور کے جلسہ میں پڑھی تھی۔ اس وقت آپ نہ بی۔ اے تھے نہ ایم۔ اے نہ پروفیسر ایک معمولی مگر ذہین طالب علم۔ آج وہی نظم ان کی نظر ثانی اور اجازت کے بعد میگزین میں اس وقت شائع ہوئی ہے۔ جبکہ آپ خدا کے فضل سے ایم۔ اے بھی ہیں بیرسٹر بھی اور ایل ایل

---

[1] فکر اقبال از خلیفہ عبدالحکیم ص ۱۶ [2] بانگ درا، دیباچہ ص ز

[3] منشی محمد دین فوق کی تحریک پر پڑھی تھی۔

[4] "انجمن کشمیری مسلمانان" اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے ایک انجمن کشمیری مسلمانان کے نام سے قائم کی جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے : ۱۔ اصلاح رسوم شادی و غمی ۲۔ کشمیری مسلمانوں میں تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کو رواج دینا ۳۔ قوم میں اتحاد و اتفاق بڑھانا۔" (اقبال نمبر، ادبی دنیا دور ششم شمارہ ۲۴ ص ۱۹۶)

ڈی اور پی۔ ایچ۔ ڈی بھی، اور زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ باوجود
اس شہرت اور علمی اعزاز کے اہل خط بھی ہیں بلکہ انجمن کشمیری مسلمانان
لاہور کے جنرل سکریٹری ہیں [1]"

علامہ اقبال اس انجمن سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے جلسوں میں پرجوش، بامقصد اصلاحی نظمیں پڑھتے تھے تاکہ قوم کی اصلاح اور فلاح کے لیے کچھ کر سکیں۔ یہ نظم "فلاح قوم" جو ستائیس اشعار پر مشتمل ہے انجمن کے اسی مقصد اور اقبال کے اسی جذبے کی ترجمانی کرتی ہے۔

سنہ ۱۸۹۶ء میں علامہ اقبال نے مولانا ابوسعید محمد شعیب کی تصنیف "مختصر العروض" کے لیے ایک "قطعۂ تاریخ" تحریر کیا۔ اس وقت اقبال بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ یہ قطعہ اس کتاب کے آخر میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کی تقریظ، خان احمد حسین احمد اور سیّد غلام بھیک موّاج کے قطعات تاریخ کے ساتھ شائع ہوا جس میں علامہ اقبال کا نام اس طرح درج ہے:

"شاعرِ باکمال، ناظم عالی جناب منشی محمد اقبال شاگرد جناب داغ دہلوی
متعلم بی۔ اے کلاس گورنمنٹ کالج لاہور [2]"

یہ قطعہ تاریخ گیارہ شعر پر مشتمل ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

مصنف جبکہ ایسا ہو، رسالہ کیوں نہ ہو ایسا
گہر باری تقاضا ہے مزاج ابر نیساں کا

اس سال علامہ کی صرف ایک غزل مطبوعہ صورت میں ملتی ہے جو شور محشر دمشاعرہ لاہور کا ماہوار رسالہ کے دسمبر سنہ ۱۸۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ مطلع یہ ہے:

تصوّر بھی جو بندھتا ہے تو خال روئے جاناں کا
بلندی پر ستارہ ہے شبِ تاریک ہجراں کا

یہ غزل بیس اشعار پر مشتمل ہے مقطع اس لیے اہم ہے کہ اس میں داغ کی شاگردی پر فخر کیا گیا ہے۔

---

[1] نوادرِ اقبال ص ۷۹۔ [2] باقیات اقبال از قاضی افضل حق قرشی اردو کراچی شمارہ ۳ سنہ ۱۹۶۵ء

نسیم[1] وتشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

محمد عبداللہ قریشی اس غزل کے بارے میں رقمطراز ہیں :

" اقبال بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو چکے تھے کہ فوق صاحب ۳۱ر جنوری ۱۸۹۶ء گھڑتل (ضلع سیالکوٹ) سے ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کی انجمن اتحاد کے مشاعروں کی دھوم سن کر وہاں پہنچے اور ان میں شریک ہو کر داد سخن دینے لگے۔ ایک مشاعرے میں جس کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی ؏

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبال نے غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر یوں فخر کا اظہار کیا گیا ہے[2]

۱۸۹۰ء کے آٹھ قطعات ملتے ہیں جو پندرہ ستمبر ۱۹۰۱ء کے کشمیری گزٹ میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ قطعات کشمیر اور اہل کشمیر سے متعلق ہیں۔ " نوادر اقبال " میں ایک قطعہ زیادہ ہے۔ یعنی اس میں نو قطعات درج ہیں۔

۱۸۹۸ء میں اقبال کا کوئی کلام شائع نہیں ہوا۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اقبال نے کچھ نہ کہا ہو، البتہ اس کا احتمال ہے کہ کہیں ضائع نہ ہو گیا ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل ہو۔

۱۸۹۹ء کا بھی کوئی کلام شائع نہیں ہوا ہے البتہ ایک خط بنام مولانا احسن مارہروی دستیاب ہے جو نہایت اہم ہے۔ اس سے اقبال کے ابتدائی زمانہ کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ملاحظہ کیجیے :

---

[1] نسیم بھرت پوری تشنہ بلند شہری۔

[2] "اقبال اور فوق" اقبال نمبر ادبی دنیا، دور ششم شمارہ ۴ ص ۲۳۳۔
" نوادر اقبال " مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۲۹۱۔

مکرمی بندہ جناب میر صاحب السلام علیکم

دونوں رسالے پہنچے۔ سبحان اللہ نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستہ کو کوئی غزل نہیں دی۔ انشاء اللہ تعالیٰ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں، اگر آپ کے پاس استادی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے بہت ممنون ہوں گا، اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمایئے گا کہ کہاں سے مل سکتی ہے۔ میں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعرا کے فوٹوز کے لیے امریکہ لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہ عنایت جلد مطلع فرمایئے حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے [1]

والسلام

خاکسار محمد اقبال

از لاہور گورنمنٹ کالج، بورڈنگ ہاوس

۲۸ فروری ۱۸۹۹ء

۱۹۰۰ء میں علامہ اقبال کی مندرجہ ذیل تخلیقات منظر عام پر آئی تھیں:

نالۂ یتیم	۲۱ فروری ۱۹۰۰ء
اقبال کی ایک الوداعی نظم	۲۵ مئی ۱۹۰۰ء
ابر گہربار (فریادِ اُمّت)	۱۹۰۰ء
ہمالہ (کوہستانِ ہمالہ)	۱۹۰۰ء

غزل (لاکھ سرتاج سخن ناظم شرواں ہوگا) اُنّیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے شروع کی غزل[2]۔ "نالۂ یتیم" علامہ اقبال کی پہلی طویل نظم ہے جو مسدس کے ۳۵ بند پر مشتمل ہے۔ اسے انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ منعقدہ ۱۸۹۹ء میں پڑھا تھا۔

---

[1] اقبال نامہ ص ۳۔

[2] سرود رفتہ ص ۱۴۷

منشی محمدالدین فوقؔ جو کشمیری تھے اور علامہ اقبال کے بڑے اچھے دوست تھے اس نظم کے متعلق لکھتے ہیں :

"لیکن جس نظم سے آپ کی شہرت ہندستان کے علمی طبقہ اور بالخصوص پنجاب کے ہر کس و ناکس میں پھیلی وہ "نالۂ یتیم" کی نظم تھی، جو ۱۸۹۹ء میں دوستوں کے اصرار سے آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں عجیب سوز و گداز اور دلنشیں سروں میں پڑھی۔ نظم کا مضمون اور اس کا انداز بیان کچھ ایسا مقبول ہوا کہ لوگ بار بار سنتے تھے اور متاثر ہو کر انجمن کے لیے روپے کی بارش برساتے تھے اور پھر بھی سیر نہ ہوتے تھے، اس کے بعد انجمن کے ہر سالانہ اجلاس میں نظم اقبال ایک ضروری جزو ہو گئی ہے۔"[1]

"نالۂ یتیم" کے بارے میں عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں :

"۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کا جو سالانہ جلسہ ہوا، اس میں اقبال نے ایک نظم "نالۂ یتیم" کے عنوان سے پڑھی، نظم بے حد مؤثر تھی اور ترنم اس سے بھی زیادہ مؤثر تھا۔ چنانچہ اس پر ہزاروں حاضرین اشک بار ہوئے اور دور دور تک اس نظم کی دھوم مچ گئی، بہت سی مجلسوں اور انجمنوں کی طرف سے اقبال کو فرمائشیں موصول ہونے لگیں لیکن انھوں نے ہمیشہ ان فرمائشوں کی تعمیل سے انکار کیا ہے۔"[2]

محمد عبدالرزاق مرتب کلیات اقبال بیان کرتے ہیں :

"سب سے اوّل اقبال نے احباب کے اصرار اور تقاضے پر ایک طویل نظم بہ عنوان "نالۂ یتیم" ۱۸۹۹ء میں لکھی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسے میں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ پڑھی حاضرین جلسہ ہمہ تن گوش تھے۔ ان کی آنکھیں اشک بار تھیں ان پر ایک وجد

---

[1] حالات اقبال از فوق۔ انوار اقبال ص ۸۴-۸۵۔

[2] ذکر اقبال ص ۴۰۔

کی سی کیفیت طاری تھی، یہ نظم سراپا سوز و گداز اور مجسّم درد و تاثیر ہونے کے باعث خاص و عام میں اس قدر مقبول ہوئی کہ ایک دفعہ پڑھی جانے سے تسلّی نہ ہوئی۔ اکثر بند بار بار پڑھوائے گئے جن کا اثر سامعین پر یہ ہوا کہ ان کے سست پائے عمل چست ہو گئے اور ان کی اخوّت اور ہمدردی ایسی شکل میں ظاہر ہوئی کہ چاروں طرف سے چندوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور بے کس اور بے بس اطفال قوم کے واسطے سیم و زر کا ایک ڈھیر لگ گیا۔۔۔۔ اس نظم نے اقبال کی شہرت کراچی سے رنگون اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلا دی ہے"۔

رودادِ انجمن بابت ۱۹۰۰ء میں اس نظم کے بارے میں جو کچھ تحریر ہے اسے مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے:

"یہ پہلی نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ اجلاس (منعقدہ ۲۳-۲۴-۲۵ فروری ۱۹۰۰ء) میں پڑھی اور جس سے ان کی شاعرانہ شہرت کا آغاز ہوا۔ یہ نظم ۲۴ فروری کے تیسرے اجلاس میں بعد نماز عصر پڑھی گئی تھی، شمس العلماء مولانا نذیر احمد خاں اس اجلاس کے صدر تھے، انجمن کی روداد مظہر ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے "نالۂ یتیم" جو چھپا ہوا تھا پڑھنا شروع کیا، اس کے ہر ایک شعر پر تحسین و آفریں کے نعرے چاروں طرف سے بلند ہو رہے تھے اور سیکڑوں آنکھیں تھیں جو دریائے اشک بہا رہی تھیں اس کے پڑھنے کے دوران میں تین سو روپے سے کچھ اوپر نقد چندہ ہو گیا اور کل کاپیاں اسی نظم کی اسی وقت فروخت ہو گئیں نظم ایسی مقبول ہوئی کہ چار چار روپے کو بھی ایک ایک کاپی بکی [1]۔

(رودادِ انجمن بابت ۱۹۰۰ء ص ۳۰/۳۱)

مولانا نذیر احمد خاں شاعروں کی حوصلہ افزائی کے عادی نہ تھے لیکن نظم سن چکنے

---

[1] کلیاتِ اقبال ص ۴۰۔

کے بعد انھوں نے فرمایا :

"میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سُنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی [1]"

مختلف حضرات کی تحریروں کے مندرجہ بالا اقتباسات خاص طور سے اس لیے پیش کیے گئے ہیں تاکہ اس نظم کی اہمیت، قدر و قیمت اور مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکے اور آسانی کے ساتھ محسوس کیا جا سکے کہ علامہ اقبال نے ابتدا ہی میں کامیابی کی کس منزل کو جا لیا تھا۔ ان اقتباسات سے اقبال کی اپنی طبیعت، مزاج اور رجحان کی بھی جھلک ملتی ہے جس کی وجہ سے اسی زمانے سے ان کی شخصیت کا احترام نگاہوں میں اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم "فریادِ اُمّت" بارہ بند (۱۴۸ شعر) پر مشتمل ہے۔ عبدالغفار شکیل مرتب "نوادرِ اقبال" کی تحریر کے مطابق یہ نظم "ابرِ گہربار" کے نام سے ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں خود علامہ اقبال نے پڑھی تھی۔ سیّد عبدالواحد معینی ایم۔ اے آکسن معتمد مجلس اقبال کراچی اپنی کتاب "باقیات اقبال" میں تحریر کرتے ہیں :

"یہ نظم لاہور کے ایک ناشر نے مندرجہ ذیل شذرہ کے ساتھ شائع کی تھی۔ وہ مقبول نظم جو جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے نے تقریباً ۱۲ سال ہوئے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں (تخیلاً بآستانہ سرورِ کائنات خلاصۂ موجودات) عاشقانہ فریاد کے رنگ میں "ابرِ گہربار" کے عنوان سے پڑھی تھی ازاں بعد ۱۹۱۲ء میں (باجازت مصنّف) فریادِ اُمّت کے نام سے چھاپ دی گئی [2]"

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے اٹھارویں سالانہ اجلاس یکم مارچ ۱۹۰۳ء میں پڑھی۔ محمد انور حارث نے اپنی کتاب "رختِ سفر" میں مارچ

---

[1] سرود رفتہ ص ۶۔

[2] باقیات اقبال ص ۲۶۔ [3] ص ۴۵۔

۱۹۰۴ء تحریر کیا ہے۔ عبداللہ قریشی نے اپنے مضمون "اقبال اور انجمن کشمیری مسلماناں" میں ۱۹۰۱ء بیان کیا ہے۔ میں نے پہلے بیان کو صحیح مانا ہے اور اسے انیسویں صدی کی نظموں میں شمار کیا ہے۔

اس صدی کی آخری نظم "ہمالہ" یا "کوہستان ہمالہ" جو اُنیسو صدی کے آخر میں کہی گئی ہے اور پہلی بار مخزن لاہور اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ بعد میں حذف و اصلاح کے بعد بانگ درا میں پہلی نظم کی حیثیت سے شامل کر دی ہے۔ بانگ درا کے دیباچہ میں شیخ عبدالقادر رقمطراز ہیں:

> "۔۔۔۔ شیخ محمد اقبال نے اس کے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں "کوہ ہمالہ" سے خطاب ہے پڑھ کر سنائی اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں، اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے مگر شیخ صاحب یہ عذر کر کے کہ ابھی نظر ثانی کی ضرورت ہے، اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میں نے ادب اور اُردو کی ترقی کے لیے رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا، اس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصہ نظم کے لیے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انھوں نے کہا کہ ابھی کوئی نظم تیار نہیں۔ میں نے کہا "ہمالہ" والی نظم دے دیجیے اور دوسرے مہینے کے لیے کوئی اور لکھیے انھوں نے اس نظم کو دینے میں کچھ پس و پیش کی، کیونکہ انھیں یہی خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا کہ بہت مقبول ہوئی۔ اس لیے میں

لہ اقبال نمبر ادبی دنیا لاہور ص ۱۹۶۔

نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے
نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع کر دی۔"

اس تحریر سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نظم "ہمالہ" اُنیسویں صدی کے آخر زمانے میں ہی کہی گئی تھی۔ اس صدی کی غالباً آخری غزل شیخ عبدالقادر کی فرمائش سے گمان ہے فی البدیہہ کہی گئی تھی جس کا مطلع یہ ہے:

لاکھ سرتاج سخن ناظم شرواں ہوگا
پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا

اس غزل کو مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سرودِ رفتہ" میں یہ تحریر کرتے ہوئے شامل کیا ہے:

"یہ غزل اُنیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل کی ہے۔"[1]

لیکن ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

"اتنا تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ غزل اُنیسویں صدی کے اواخر کی نہیں ہے اب بیسویں صدی کے اوائل کا نفاذ کب تک ہوگا۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ اسرارِ خودی کے بعد کی غزل ہے اس لیے کہ اس سے پہلے اور کہیں بھی مردِ مومن کا لفظ یا خودی کا لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے۔"[2]

میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مولانا غلام رسول مہر کی بات کو ردّ کرنے کے لیے ابھی ہمارے پاس کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کی بات سے بات نہیں بنتی، ممکن ہے کہ آگے کوئی ایسا ثبوت فراہم ہو جائے کہ یہ غزل بیسویں صدی کی ثابت ہو جائے ابھی تو میں مولانا غلام رسول مہر کے خیال کے پہلے حصّے کو مانتے ہوئے اسے "انیسویں صدی کے اواخر" کی ہی مانتا ہوں۔

اُنیسویں صدی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے داغ کی شاگردی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے لیکن ان کی شاعری کا رنگ اقبال کی بعد کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ اس لیے کہ داغ

---

[1] سرودِ رفتہ ص ۱۴۷۔
[2] اقبال کے ابتدائی افکار ص ۱۴۲

سے علامہ اقبال نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کی شاعری کی قدر و قیمت سے آگاہ اور ان کی شخصیت کے قدرداں تھے۔ چنانچہ ان کی وفات پر ۱۹۰۵ء میں ایک یادگار نظم جو انھوں نے قلم بند کی تھی اس کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

عظمت غالب ہے اک مدّت سے پیوندِ زمیں — مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر — چشمِ محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے — شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے
چل بسا داغؔ آہ میت اس کی زیب دوش ہے — آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے
اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں — تو بھی رو اے خاکِ دلّی داغ کو روتا ہوں میں[1]

ان اشعار کے مطالعہ سے اقبال اور داغؔ کے تعلق اور اقبال کے دل میں داغؔ کے لیے جس قسم کے جذبات تھے ان سے اندازہ نہایت واضح طور سے لگایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کی اس دور کی غزل گوئی کا تعلق ہے ان کی سب سے پرانی غزل جسے محققین کی تیز نگاہوں نے ڈھونڈنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، ستمبر ۱۸۹۳ء میں گلدستہ زبان دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ غزل پہلے لکھی گئی ہو اور بعد میں شائع ہوئی ہو، اس سے قبل کا اقبال کا کلام یا تو ضائع ہو گیا ہے یا ابھی تک نگاہوں سے اوجھل ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اقبال نے اس سے پہلے کوئی غزل کہی ہی نہ ہو، بہرحال اُنیسویں صدی کے آخر میں آٹھ سال کی مدت میں اقبال کی کل چھے غزلیں تلاش کے بعد حاصل ہو سکی ہیں جن میں سب سے مختصر غزل پانچ شعر کی ہے اور سب سے طویل غزل بیس اشعار پر مشتمل ہے۔ مجموعی حیثیت سے چھے غزلوں میں کل باسٹھ شعر ہیں جو عام طور سے سادہ، عاشقانہ اور قدیم انداز کی رسمی ہیں۔ ان غزلوں میں وہی لہجہ، وہی ہلکے پھلکے جذبات اور وہی احساسات ملتے ہیں جن کا اظہار اس زمانے میں اردو کے دوسرے بہت سے شعرا عام طور سے کر رہے تھے یا کر چکے تھے۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا یہی رنگ و آہنگ عوام میں مقبول تھا اور انھیں فرسودہ خیالات کی تکرار اور سستے جذبات کے اظہار کو شاعری سمجھا جا رہا تھا۔ علاّمہ اقبال کی عمر ہی کیا تھی، وہ اس وقت اس دامِ خیال سے

---

[1] "یادگار داغ نمبر" مخزن لاہور اپریل ۱۹۰۵ء میں یہ نظم شائع ہوئی ہے۔

نکل کر علاحدہ راگ کیوں کر الاپ سکتے تھے چنانچہ اسی رنگ میں رنگ گئے، اور انھیں الفاظ تشبیہات، تلمیحات، تراکیب اور موضوعات کے سہارے غزل گوئی کی ابتدا کی جو اس وقت غزل کی دنیا میں مستعمل تھے۔ جدید تحقیق کے مطابق علاّمہ اقبال نے اس دور میں کل چھے نظمیں کہی ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی ابتدائی نظم گوئی کے میلانات، موضوعات لب و لہجہ اور انداز فکر کا پتا چلتا ہے۔ اقبال کی غزلیں ۱۹۹۳ء تک کی مل جاتی ہیں لیکن سب سے پرانی نظم تقریباً تین سال بعد یعنی ۱۸۹۶ء کی دستیاب ہوئی ہے آیندہ ممکن ہے محقّقین اس سے پہلے کی نظمیں دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کرلیں۔ بہر حال ان نظموں کی روشنی میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اقبال اجتماعی شعور، قومی احساس اور وطن پرستی کا نہایت پاکیزہ جذبہ رکھتے تھے۔ ان نظموں میں بعض حصّے ایسے ہیں جن کے مطالعہ سے اقبال کی پوری قوم کی اصلاح اور راست روی کی پوشیدہ تمنا کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے قلب و نظر دونوں کی کیفیات سے آگاہی ہوتی ہے اور اس طرح اس وقت کے اقبال کو سمجھنے، بوجھنے اور پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔

اقبال کی نظم گوئی

(۱۹۰۱ء — ۱۹۰۵ء)

اُنیسویں صدی نے جب رخصت ہوتے ہوئے الوداع کہا اور بیسویں صدی کی حدود میں اقبال داخل ہوئے تو وہ ایک تیئیس[۲۳] چوبیس[۲۴] سال کے وجیہہ اور تندرست نوجوان ہی نہیں تھے بلکہ بی۔ اے میں انگریزی اور عربی میں اوّل آنے کی وجہہ سے طلائی تمغہ حاصل کر چکے تھے اور ایم۔ اے میں ساری یونی ورسٹی میں اوّل آکر ایک اور طلائی تمغہ کے حقدار ٹھہر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جہاں ان کی تعلیم کی ابتدا میر حسن جیسے فاضلِ دوراں بزرگ کے ہاتھوں ہوئی تھی، وہاں پروفیسر آرنلڈ جیسے عالمِ وقت فلسفہ کے اُستاد سے ان کے فلسفیانہ ذہن نے آبیاری پائی تھی اور تربیت کی منزلیں طے کی تھیں۔

بیسویں صدی نے اقبال کو گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے تاریخ اور سیاست مُدن کی درس و تدریس میں مصروف پایا۔ داغ کے مشہور شاگردوں میں ان کا نام سرِ فہرست نظر آیا اور داغ ہی کے رنگ میں ان کی غزلوں کو رنگا ہوا محسوس کیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے بعض شعروں کے مخصوص لہجے اور فکر انگیز خیالات پر لوگوں کو چونکتے ہوئے دیکھا گیا۔ جن میں خاص طور سے یہ اشعار قابلِ ذکر ہیں:

۱؎ ۱۸۹۷ء ۲؎ ۱۸۹۹ء

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

موت بولی جو ہوا کوچۂ قاتل میں گزر
سر اسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا

۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو انھوں نے اورینٹل کالج لاہور میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔ اسی سال وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کی مجلس انتظامیہ میں رکن کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ اسی کے ساتھ ان کا رشتہ انجمن کے ساتھ قائم ہو گیا اور وقت کے ساتھ مضبوط تر ہوتا گیا۔ جس نے آگے چل کر یعنی بیسویں صدی کی ابتدا میں اقبال کی زندگی اور ذہن کی تعمیر میں نمایاں حصّہ لیا۔ اس انجمن کے علاوہ سر عبدالقادر اور ان کے ماہنامہ رسالہ مخزن نے ان کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں نہ صرف خاص ذمہ داریاں سنبھالیں بلکہ ان کی ذہنی تربیت اور فکری رہنمائی اور مستقبل کے راستے کے تعیّن میں بڑی مدد کی۔

انجمن حمایت اسلام ہی سے اُن کی طویل اصلاحی نظموں کی ابتدا ہوتی ہے جن کو وہاں کے جلسوں میں اقبال ایک ایسے ترنّم کے ساتھ سناتے تھے اور سامعین اس کے اصلاحی اور تعمیری جذبے سے نہ صرف سرشار ہو جاتے تھے بلکہ تازہ دم ہو کر قومی خدمات کے لیے بڑے جوش اور جذبے کا ثبوت دیتے تھے۔ اقبال نے اس انجمن میں پہلی نظم "نالۂ یتیم" اس کے پندرھویں سالانہ جلسے میں ۲۴ فروری (سنہ ۱۹۰۰ء) کو پڑھی، جس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو اس وقت تک ملّی اور قومی مسائل سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس نظم نے جہاں انجمن حمایت اسلام کے ذریعہ قوم کے افکار و خیالات کی تعمیر و تربیت کی کوشش کی، وہیں اقبال کا ذہن بنا، پروان چڑھا اور

وہ ایک خاص انداز فکر کی دولت سے مالامال ہوئے۔ ملّت کا درد، اس کے لیے کچھ کرنے کی خواہش کے ساتھ انسانوں کے دکھ درد میں کام آنے کے جذبے کی کارفرمائی، وسیع تر انسانیت کے لیے فکرمندی اور اضطراب کی طرف یہ نظم اشارہ کرتی ہے[1]

بیسویں صدی میں "یتیم[2] کا خطاب ہلال سے" پہلی نظم ہے جو اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سولھویں جلسے منعقدہ ۲۴/ فروری ۱۹۰۱ء میں پڑھی۔ یہ نظم

---

[1] اس کے بعد ۱۹۰۵ء تک علّامہ نے جو نظمیں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) دردِ دل - ایک یتیم کا خطاب ہلال عید کو"۔ ۲۴/ فروری ۱۹۰۱ء (سرود رفتہ میں) یتیم کا خطاب ہلال عید سے

(۲) خیر مقدم (اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۷۵) ۲۲/ فروری ۱۹۰۲ء
لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر کا خیر مقدم (سرود رفتہ ص ۱۷۶) ۲۲/ فروری ۱۹۰۲ء
قصیدہ (نوادر اقبال مرتبہ عبدالغفار شکیل

(۳) دین و دنیا انوار اقبال ص ۱۵۵ سرودِ رفتہ ص ۳۸ ۲۲/ فروری ۱۹۰۲ء
اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۷۶

(۴) اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے ۲۲/ فروری ۱۹۰۲ء

(۵) دل بانگ درا۔ ص ۵۴
ابر گہربار : فریادِ اُمّت : سرود رفتہ ص ۴۲
// نوادر اقبال ص ۴۸

(۶) تصویر درد — ۲/ اپریل ۱۹۰۴ء
بانگ درا ص ۶۲ نوادر اقبال ص ۱۶۵
سرود رفتہ ص ۱۱۵ اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۷۱-۷۴

[2] "دردِ دل" نوادر اقبال ص ۱۲۲ پر "ایک یتیم کا خطاب ہلال عید کو" کے عنوان سے شائع ہوئی اور "یتیم کا خطاب ہلال عید سے" کے عنوان سے سرود رفتہ ص ۱۸ پر شائع ہوئی ہے۔

اس وقت تک اقبال کی کہی گئی نظموں میں سب سے طویل ہے یعنی ۱۵۰ اشعار پر مشتمل ہے، یہ بات حیرت کی ہے کہ اقبال نے اس قدر طویل نظم جلسہ میں بیٹھ کر دلچسپی کے ساتھ سنائی اور مجمع نہایت ذوق وشوق سے سنتا رہا۔

اس نظم میں اقبال نے ایک یتیم کے دکھ درد کو ایک غیر ناطق یعنی چاند کو مخاطب کر کے سنانے کی کوشش کی ہے۔ لہجہ نہایت درد مندانہ ہے لیکن کہیں کہیں فارسیت کی گرانی بھی محسوس ہوتی ہے، البتہ بعض حصّے نہایت سلیس اور بچوّں کے جذبات اور مزاج کو پیش کرتے ہیں۔ بند ہشتم ملاحظہ کیجیے:

سیر میں اب نہ دل لگائیں گے — کس کی انگلی پکڑ کے جائیں گے
صبح جانا کسی کا وہ گھر سے — اور وہ رونا کہ ہم بھی جائیں گے
کھیل میں آگئی جو چوٹ کبھی — کس کی آنکھوں سے اب چھپائیں گے
کوئی ناغہ جو ہو گیا تو کسے — ساتھ مکتب میں لے کے جائیں گے
سننے والے گزر گئے اے دل — اپنے شکوے کسے سنائیں گے
اُٹھ گئے آہ قدرداں اپنے — لکھ کے تختی کسے دکھائیں گے
درد دل کی زباں نرالی ہے — تجھ کو اے خامشی! سکھائیں گے
کس غضب کے نصیب ہیں اپنے — روتے آئے تھے روتے جائیں گے
عید آئی ہے اے لباس کہن — اب ترے چاک پھر سلائیں گے
عید کا چاند آشکار ہوا — تیر غم کا جگر کے پار ہوا[1]

اس نظم کے ذریعہ اقبال نے قوم میں یتیم بچوّں کی وجہ سے جو ایک اہم مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اس کی طرف عوام وخواص کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کی روداد انجمن کے ضمیمہ نمبر ۱۱ میں درج ہے:

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے جنھوں نے اپنی خدا داد استعداد اور لیاقت سے گذشتہ سال سے انجمن کے سالانہ جلسے میں ایک

---

[1] سرودِ رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر ص ۲۴

نئی روح پھونکی ہے، پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور اپنی نظم الملقب بہ " درد دل یا ایک یتیم کا خطاب ہلال عید کو " پڑھنی شروع کی۔ نظم گو فی نفسہٖ ہر ایک حیثیت سے بے نظیر تھی، مگر شیخ صاحب کا انداز، ادا اور طرز بیان اس کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ اور شعر سامعین کے دلوں پر کچھ ایسا ساحرانہ اثر ڈال رہے تھے کہ اکثر بندوں کے دوبارہ پڑھے جانے کی بار بار آرزو کی جاتی تھی . . . لہ "

دوسری نظم " لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر صاحب کا خیر مقدم " ہے، جو نوادر اقبال مرتبہ عبدالغفار شکیل میں قصیدہ کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس میں کل ۲۲ شعر ہیں جو ذوق کے قصیدے کی بحر اور قافیہ میں ہیں۔

جیسا کہ عام طور سے قصیدہ کا تقاضا ہوتا ہے، اقبال نے اس قصیدے میں لاٹ صاحب اور ڈائرکٹر صاحب کی تعریف بھی کی ہے اور ان کے لیے دعائے خیر بھی۔ زبان شستہ اور پُر وقار ہے جو اقبال کا طرۂ امتیاز ہے۔ نظم کے مطالعہ سے بھی اقبال فہمی میں مدد ملتی ہے کہ وہ لاٹ صاحب کی تعریف کس انداز سے اور کس حد تک کر سکے تھے۔

تیسری نظم " دین و دنیا " پچپن اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں اقبال کے یہاں مزاح اور طنز کے عناصر جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اقبال نے اُن مولویوں کو نشانہ بنایا ہے جو انگریزی تعلیم کے دشمن تھے اور دین کو دنیا سے الگ متصوّر کرتے تھے گویا سرسیّد کے مخالف تھے۔ علاّمہ اقبال نے ایسے حضرات کے لیے جو فکری اعتبار سے نہایت تنگ نظر ہیں ایک خاص ظریفانہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

مسلموں کو فکر دیں اور فکر دنیا کچھ نہ ہو کچّے حنظل کی طرح یہ بھی خیال خام ہے

لہ نوادر اقبال مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۱۲۲

جب کہا حضرت! کہ ہیں اب ڈھنگ ہمدردی کے اور　　دین کی تائید انگریزی پڑھوں کا کام ہے

جوش میں کیا آئے اک سوڈے کی بوتل کھل گئی　　گالیوں کے بس سے منہ ان کا چھلکتا جام ہے

بیچتے ہیں برف کی قفلی دسمبر میں چہ خوش　　ایسے دینداروں کا سر بے عین و قاف و لام ہے

سر جھکائے ایک دن جاتا تھا میں ٹکسال کو　　دائیں بائیں گھورنے سے آنکھ کو کیا کام ہے

ذکر جب اقبال کا آیا تو بول اٹھا کوئی　　رہتا ہے بھائی میں اک دیوانۂ اصنام ہے

"اسلامیہ[1] کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جانے والی نظموں میں چوتھی ہے۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام میں یہ نظم "زبان حال" کے عنوان سے درج ہے۔ یہ طویل نظم "نو بند" پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا تیسرا شعر فارسی میں ہے آخری بند (نہم) مکمل فارسی میں ہے، غالباً فارسی میں شاعری کا سلسلہ اسی نظم سے شروع ہوتا ہے۔

اس نظم میں ایک غیر ناطق یعنی "اسلامیہ کالج" مسلمانوں سے مخاطب ہے جس میں مسلمانوں سے ان کی بے حسی کی شکایت کی گئی ہے اور جواب شکوہ کی زبان میں آیندہ کے لیے رہبری بھی کی گئی ہے۔ زباں رواں دواں اور پُر درد ہے۔ اس کی ابتدا کچھ اس طرح ہے:

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج　　آئینہ کو ہے سکندر سے ہر تقریر آج
نقش نے نقّاش کو اپنا مخاطب کر لیا　　شوخیِ تحریر سے گویا ہوئی تصویر آج

پھر عمارت کی زباں سے اقبال قوم سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

---

[1] سرود رفتہ: غلام رسول مہر ص ۳۰

میں صدف تم ابرِ نیساں، میں گلستاں تم بہار
مزرعِ نوخیز میں تم ابرِ دریا بار ہو
میں نتیجہ اک حدیثِ اُمّیِ یثرب کا ہوں
تم اُسی اُمّی کی اُمّت کے علمبردار ہو
اک مہہ نو آسمانِ علم و حکمت پر ہوں میں
تم بھی اک فوجِ ہلالی کے سپہ سالار ہو
نام لیوا اک دیارِ علم و حکمت کا ہوں میں
اور تم اگلے زمانوں کے وہی انصار ہو
یاں کبھی بادِ خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں
میں مسلمانوں کا گلشن، تم مری دیوار ہو
تم اگر چاہو تو اس گلشن کے ایسے بھاگ ہوں
ہر کلی گل ہو کے اس کی زینتِ دستار ہو

پھر اقبال ماضی کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں متوجہ کرتے ہیں۔ یہ پہلی نظم ہے جس میں یہ احساس اقبال کے یہاں شدید نظر آتا ہے:

طوسی و رازی و سینا و غزالی و ظہیر
آہ وہ دلکش مرقّع پھر دکھا سکتا ہوں میں
آئیں اُڑ اُڑ کے پتنگے مصر و روم و شام سے
شمع اک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں
آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں
گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اس زمانے کو سنا سکتا ہوں میں
ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں

اس کے ساتھ اس قسم کے قابلِ قدر جذبات اور احساسات بھی ملتے ہیں:

علم کا محبوب رونق بخش کاشانہ تو ہو
انجمن اپنی مثالِ بزمِ جانانہ تو ہو
پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا
پھر ذرا بھولا ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو
بزم میں شوقِ مئے حکمت ہوا پیدا مگر
مے بھی بٹ جائے گی پہلے فکرِ پیمانہ تو ہو
پائمالی ہے جہاں میں ترکِ حکمت کی سزا
اس چمن سے مثلِ سبزہ کوئی بیگانہ تو ہو

پوری نظم سنجیدہ، پُرشکوہ اور پُر درد لہجے میں پیش کی گئی ہے جس کے ذریعہ خفتہ قوم کو بیدار اور اسے تعلیم کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اقبال کی پہلی طویل نظم ہے جس میں ایک نئے انداز سے تعلیم کی اہمیت کے پیشِ نظر قوم کی رہبری ملتی ہے۔

مندرجہ بالا چار نظمیں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ایک خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پڑھی گئی تھیں۔ اقبال کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی اور ان سے ان کو شہرت اور مقبولیت بھی ملی تھی لیکن پھر بھی یہ نظمیں بانگ درا کے لیے انتخاب نہیں کی گئیں۔ کلیاتِ اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق میں بھی نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دانستہ ایسا نہیں کیا گیا ہو۔

ان کے علاوہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء کے دوران میں اقبال کی دو نظمیں مزید ایسی ملتی ہیں۔ جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں پڑھی تھیں۔ پہلی نظم "ابر گہربار"[1] یا "فریادِ امّت" یکم مارچ ۱۹۰۳ء کو پڑھی تھی اور جو "دل" کے عنوان سے بانگ درا میں شائع ہوئی ہے اور دوسری نظم "تصویرِ درد" کے عنوان سے ۲/ اپریل ۱۹۰۴ء کو انجمن کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔

پہلی نظم "ابر گہربار" یا "فریادِ اُمّت" بارہ بند پر مشتمل ہے جس کا تیسرا بند "دل" کے عنوان سے بانگ درا میں شائع ہوا ہے۔ باقی گیارہ بند حذف کر دیے گئے ہیں۔ اس نظم کی حیثیت نعت کی ہے، علامہ اقبال نے عالم خیال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانۂ مبارک پر پڑھی تھی جس کے دوسرے بند میں اقبال اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

ضبط کی جا کے سنا اور کسی کو ناصح — اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں
ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا — کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں
رِند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے — سُن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

---

[1] ابرِ گہربار۔ فریادِ اُمّت: سرودِ رفتہ ص ۴۲۔
: نوادرِ اقبال مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۸۴۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں
کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی کہتا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں
ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے نگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں
دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

اور رسولؐ سے مخاطب ہو کر بولتے ہیں:

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ
دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر
مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے
میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد سیّد مکّی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

لاکھ سامان ہے اک بے سروساماں ہونا
مجھ کو جمعیّت خاطر ہے پریشاں ہونا
تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں
"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

کبھی یورپ میں اویسِ قرنی سے چھپنا
کبھی برقِ نگہہ موسیِ عمراں ہونا

میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی
دیکھنا، دیکھنا، وہ کافرِ دیندار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر
نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اُٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو

عشقِ رسول سے سرشار ہو کر ہی کوئی اس طرح کے اشعار کہہ سکتا ہے، ان اشعار میں بیباکی بھی ہے اور والہانہ پن بھی ہے۔ آگے اُمّت کا حال، نہایت دردمندی کے ساتھ حضور اکرمؐ کے حضور میں پیش کرتے ہیں:

حال اُمّت کا برا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفت آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دنیا کو بُرا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھّا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

اس طرح مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کے بُرے حالات بیان کر کے رسولؐ سے مدد کے طالب ہوتے ہیں اور تمام خرابیوں کی دوا چاہتے ہیں:

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے؟

جس کی تاثیر سے ہو عزّتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر وہ دوا کون سی ہے؟

جس کی تاثیر سے یک جان ہو امّت ساری
ہاں بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے؟

جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی
ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے؟

قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کہاں ہے وہ آوازِ درا کون سی ہے؟

اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی
جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے؟

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی اُمید یہاں تیرے سوا کون سی ہے؟

طویل نظم ہونے کے باوجود، نہایت پُروقار، پُردرد، جذبہ سے سرشار، ملّت کے غم سے ہمکنار اور فکر انگیز ہے، اردو کے نعتیہ سرمایے میں اس کی انفرادیت اور خصوصیات کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت ہمیشہ برقرار رہے گی، معلوم نہیں کن وجوہ سے اس نظم کا صرف ایک بند بانگِ درا میں انتخاب کیا گیا ہے۔

اس دوران میں انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جانے والی آخری نظم "تصویرِ درد"[1] ہے جو ۱۲ اپریل ۱۹۰۴ء کے جلسہ میں پڑھی گئی تھی، اور ۱۲۸ اشعار پر مشتمل ہے بانگ درا میں کل ۶۹ اشعار انتخاب کیے گئے ہیں۔ پوری نظم دس بند پر مشتمل ہے۔

انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جانے والی یہ پہلی نظم ہے جس میں وطن کی حالت زار

---

[1] نوادر اقبال ص ۱۶۵، سرود رفتہ ص ۱۱۵، بانگِ درا ص ۶۲
اقبال اور انجمن حمایت اسلام ۴۷، ۷۹

کا ذکر ہے اور دردمندانہ انداز میں ہے۔ اس نظم میں عجب بے چینی اور تڑپ پائی جاتی ہیں۔ نظم کی ابتدا ہی میں کچھ اس انداز کے اشعار ملتے ہیں جن سے اقبال کے دل کی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

نہیں منّت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اڑالی، قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

چوتھا بند اس کا اس لیے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال کے دل کا اضطراب چھلک گیا ہے وہ بے اختیار اپنے وطن ہندستان کی حالت زار کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں اور ہم وطنوں یعنی ہندستانیوں کو پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے فکرمند ہوتے ہیں۔ انھیں ہشیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ملاحظہ کیجیے ان کے جذبے میں کس قدر شدّت، کیسی حدّت اور کس درجہ سچائی جھلکتی ہے:

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

ہوائے امتیازِ ملّت بھی وآئیں کی موجوں نے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

نشانِ برگِ گل تک نہ چھوڑا باغ میں گلچیں
تری قسمت سے جھگڑے ہو رہے ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
غنا دل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک، لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہوا پیکار کی آخر اُجاڑے گی گلستاں کو — خدا رکھے اسے یہ بھی ہے اپنے مہربانوں میں
قیامت ہے کہ ہر ذرّے سے پیدا سو مصیبت ہے — زمیں بھی اپنی شاید جاملی ہے آسمانوں میں

پانچواں بند بھی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں بھی اقبال نے وطن سے محبّت کا والہانہ ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں وطن کی حالت زار کو دکھا کر ہندستانیوں کو اس سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کا یقین ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، ملاحظہ کیجیے:

ہو یدا آج اپنے زخم پنہاں کرکے چھوڑوں گا — لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا

تعصّب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے — وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کرکے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کرکے چھوڑوں گا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی — مسلمانوں کو آخر نامسلماں کرکے چھوڑوں گا
اٹھا دوں گا نقابِ عارضِ محبوب یک رنگی — تجھے اِس خانہ جنگی پر پشیماں کرکے چھوڑوں گا

انجمن حمایت اسلام میں پڑھی گئی یہ تمام نظمیں، اقبال نے اصلاحی اور تعمیری جذبے کے تحت لکھی ہیں اُن کے مطالعہ سے ان کے ملّی اور قومی جذبے اور ان کے لیے فکرمندی کا شدید احساس ہوتا ہے جہاں وہ اپنی ملّت کی خرابیوں کو دور کرکے اس کی تعمیر چاہتے ہیں، وہیں وہ اپنے وطن کے لیے فکرمند نظر آتے ہیں۔ یہ اُن کی وطن سے محبت کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ تعصّب کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور ایسے اسلام کو نہیں پسند کرتے جہاں تعصب کو راہ دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اسلام تعصب کو کسی قیمت پر پسند نہیں کرتا

اقبال کو اپنی ملّت کے ساتھ اپنے وطن سے جو محبّت تھی اس کی مثال اُردو کا کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کرسکتا۔ یہ بات بھی غور و خوض چاہتی ہے کہ وہ اگرچہ وطن سے بے انتہا محبت کرتے ہیں لیکن اس کا اظہار کسی قسم کی نعرہ بازی یا چیخ و پکار کی

صورت میں نہیں کرتے، بلکہ وہ نہایت دھیمے لہجے، سچے جذبے کے ساتھ اپنے وطن سے گہرے تعلق کا اظہار کرتے رہے تھے اور یہ جذبہ اُن کی زندگی کے آخری زمانے تک قائم رہا۔ اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے محسوس ہو کہ ان کے دل میں کسی بھی زمانے میں ہندستان سے محبت میں کمی پیدا ہوگئی ہو۔

اس درد کی یہ نظمیں، آفتابِ صبح، صدائے درد، آفتاب (ترجمہ گائتری) ایک آرزو، سیّد کی لوحِ تربت پر، سرگذشتِ آدم، ترانۂ ہندی، صبح کا ستارہ، ہندستانی بچّوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، پرندے کی فریاد وغیرہ ایسی ہیں جن میں کم یا زیادہ وطن سے محبّت کا جذبہ بے نقاب ہوا ہے۔ یہ سب نظمیں بانگِ درا میں موجود ہیں البتہ اصل میں کہیں کہیں اصلاح یا اشعار حذف کر دیے گئے ہیں۔

"آفتابِ صبح"[1] وطن سے گہرے تعلق کے ساتھ وسیع تر انسانی محبّت کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹے ہوئے ہے:

آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو — امتیازِ ملّت و آئیں سے دل آزاد ہو
یا بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں — نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
یا شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو — سر میں جز ہمدردیِ انساں کوئی سودا نہ ہو

"صدائے درد"[2] میں پہلا بند شاعر کی وطن سے محبّت کی شدّت اور اس کی، وطن کی حالتِ غیر پر فکرمندی اور پریشانی قابلِ غور ہے، وہ ہندستانیوں کے درمیان نااتفاقی کی وجہ سے مضطرب ہو جاتے ہیں:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوّت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

---

[1] بانگِ درا ص ۳۷ (خدنگِ نظر لکھنؤ مئی ۱۹۰۲ء)
[2] بانگِ درا ص ۲۹ (مخزن لاہور جون ۱۹۰۲ء)

"آفتاب"[1] (ترجمہ گایتری) کی تخلیق بھی ہندستان سے انتہائی محبت کا نتیجہ ہے۔
"ایک آرزو"[2] میں شاعر ہنگاموں سے تنگ آکر نیچر کے درمیان زندگی گزارنے کا آرزو مند ہے تاکہ وطن کی خراب حالت پر دل کھول کے آنسو بہا سکے اور وطن کو بھی اس کی حالت کا احساس ہو سکے:

دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پر آنسو — سرسبز جن کی نم سے بوٹا اُمید کا ہو

سمجھیں مرے سخن کو ہندوستان والے — موزون ہو گئے ہیں، نالے سخن نہیں ہے
شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن — ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر — میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت — ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے[3]

"سرسید کی لوحِ تربت"[4] میں بھی قوم کو ہشیار کرتے ہیں:

دیکھ اپنوں میں نہ پیدا ہو کہیں بیگانگی — چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو — آڑ میں مذہب کی شوقِ عزت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو، دین کی خدمت نہیں — یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنت نہیں

ہو شرابِ حُبِّ قومی میں اگر سرشار تو — ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو

کیا مزہ رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی — اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی

"صبح کا ستارہ"[5] کے مطالعہ سے وطن کی محبت اور اس کی آزادی کے لیے

---

[1] بانگِ درا ص ۳۰ (مخزن لاہور اگست ۱۹۰۲ء)
[2] بانگِ درا ص ۲۵ (مخزن لاہور دسمبر ۱۹۰۲ء) سرودِ رفتہ ص ۱۰۹۔
[3] سرودِ رفتہ ص ۱۰۹۔
[4] سرودِ رفتہ ص ۱۱۰ (مخزن جنوری ۱۹۰۳ء) [5] بانگِ درا ص ۸۶

قربانی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ستارے کی بات سُنیے:

کسی پیشانی کی افشاں کے ستاروں میں رہوں — کسی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں رہوں
اشک بن کر سرِ مژگاں سے ٹپک جاؤں میں — کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو رواں، ہو کے زرہ میں مستور — سوے میدانِ وغا، حبِّ وطن سے مجبور

لیکن اس دور کی نظموں میں "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ" کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور نظم کو حاصل نہیں ہوئی اور آج بھی اُن کے مقابلہ میں کوئی اور نظم نہیں ملتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر اقبال وطن کے لیے کوئی اور نغمہ نہ الاپتے اور صرف ترانۂ ہندی چھوڑ جاتے تو بھی اُن کا مرتبہ اپنے وطن ہندستان کے چاہنے والے شاعروں میں سب سے نمایاں رہتا۔ اس نظم کے یہ اشعار آج بھی تحریروں میں، تقریروں میں، مجلسوں میں محفلوں میں گونجتے سنائی دیتے ہیں۔ اور ایک دنیا کو وطن کا پرستار بناتے رہتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

واقعہ یہ ہے کہ اس نظم میں جس طرح وطن سے محبّت کا اظہار ہے، جس طرح سے اس کی عظمت کا اقرار ہے، جس طرح سے بے تعصبّی کا سبق دیا گیا ہے اور اس کے اظہار کے لیے جس پُر وقار اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے، اس کی مثال دوسری نظمیں نہیں پیش کر سکتیں۔

اس سلسلے کی آخری نظم "نیا شوالہ" ہے جو ترانۂ ہندی کی طرح جذبۂ حبّ الوطنی سے سرشار ہے، اس نظم میں اقبال نے نہ صرف وطن سے محبت کا درس دیا ہے بلکہ اپنے دلی جذبات اور احساسات کو بے پردہ کر کے اپنا صحیح تعارف کرایا ہے۔ حبِّ وطن کے سلسلے میں، ایسی نظمیں عام طور سے نہیں ملتی ہیں جن میں اتحاد و اتفاق کا زبردست سبق دیا گیا ہے۔ اتحاد کی دعوت

ملاحظہ کیجیے:

آ غیریت کے پردے ایک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں نقشِ دوئی مٹادیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

'بانگِ درا' ترتیب دیتے وقت اقبال نے اس نظم کے بعض اشعار حذف کردیے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوارِ دل میں لاکر اسے بٹھادیں

سندر ہو اس کی صورت، چھب موہنی ہو اس کی
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زنار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھادیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگادیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا، لے لے کے اس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہادیں

ہندوستان لکھ دیں، ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنادیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں کو، ناقوس سے ملادیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت اس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلادیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور اُن کو پیار کرنا[1]

اتحاد و اتفاق کا سبق انھوں نے محض زبانی نہیں دیا ہے بلکہ زبان سے بھی دیا ہے۔ ہندی کے ایسے الفاظ جو عام طور سے اُردو میں استعمال نہیں ہوتے تھے انھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ برجستہ، برمحل استعمال کر کے اپنی شاعری میں بڑی خوبی پیدا کردی ہے۔ اثر و تاثیر کا یہ حال ہے کہ جب بھی یہ اشعار پڑھے جاتے ہیں ایک نئی کیفیت محسوس کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے نہایت واضح طریقہ سے یہ ثابت کردیا ہے کہ ان کا دل ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے اور یہی بے تعصبی کا راستہ ملک و قوم

لہ سرودِ رفتہ ص ۱۲۵

کی فلاح و بہبود کے لیے تریاق ہے۔

اس دور میں علامہ اقبال کی کئی نظمیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں قدرت کے حسین مناظر پیش کیے گئے ہیں اور قدرت یا نیچر سے گہری وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ عام طور سے ایسی نظمیں بھی اقبال کے وطن سے گہرے تعلق کا اظہار کرتی ہیں اس لیے کہ یہ مناظر بھی ہندستان کی سیر کراتے ہیں:

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا — کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا[1]

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو — اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو[2]

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موجزن — رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن — چشمۂ دامن میں رہتی ہے، مگر پر تو فگن
چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیّال ہے — دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے[3]

نیچر سے گہرے تعلّق کا کیا اس سے بہتر اظہار کہیں اور مل سکتا ہے؟

ہو ہاتھ کا سرھانا سبزے کا ہو بچھونا — شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل — ننھّے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندّی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

---

[1] بانگِ درا ص ۵
[2] سرودِ رفتہ ص ۹۰

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

منہدی لگائے سورج جب شام کی دُلھن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو[1]

یا

گھر بنایا ہے سکوتِ دامنِ کہسار میں
آہ! یہ لذّت کہاں موسیقیِ گفتار میں

ہم نشینِ نرگسِ شہلا، رفیقِ گل ہوں میں
ہے چمن میرا وطن، ہمسایۂ بلبل ہوں میں

شام کو آوازِ چشموں کی سلاتی ہے مجھے
صبح فرشِ سبز سے کوئل جگاتی ہے مجھے[2]

"ابر"[3] سات شعر پر مشتمل مختصر نظم ہے، جس میں منظر کی تصویر کشی نہایت اچھی کی گئی ہے، آسمان پر سیاہ بادل کا اٹھنا، پہاڑ کا بادلوں میں چھپ جانا، ٹھنڈی ہوا کا چلنا، بادل کی خاموش پرواز لیکن:

ہوا کے زور سے اُبھرا، بڑھا، اُڑا بادل
اٹھی وہ اور گھٹا لو برس پڑا، بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

"کنارِ راوی"[4] میں بھی قدرت کی خوب منظر کشی ملتی ہے اور اس سے انسان کی حیات و موت کا سراغ پہلی بار لگانے کی کوشش کی گئی ہے:

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملّاح جس کا گرم ستیز

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِّ نظر سے دور گئی

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی
ابد کے بحر میں پیدا یونہی، نہاں ہے یونہی

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

علامہ اقبال نے کچھ مختصر نظمیں ایسی بھی اس دوران میں کہی ہیں جن میں وہ غیر ناطق سے ہمکلام نظر آتے ہیں، تفکّر اور تجسّس کی جو کیفیت اُن کے دل میں پیدا ہوئی ہے اور دنیا اور اس کی چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے اور انسان اور اس کی زندگی کے راز ہائے

---

[1] ایک آرزو: بانگِ درا ص ۳۵ - ۳۶

[2] رخصت اے بزمِ جہاں: بانگِ درا ص ۵۷ - ۵۸

[3] بانگِ درا ص ۹۲

[4] بانگِ درا ص ۹۶

سربستہ سے آگاہ ہونے کی جو خواہشیں پیدا ہوئی ہیں اُن کی وجہ سے اُن کے دل میں طرح طرح کے سوالات سر اٹھاتے ہیں جن کا اظہار انھوں نے بے اختیار اپنی مختلف نظموں میں کیا ہے۔ گلِ رنگیں، ابرِ کہسار، شمع و پروانہ، انسان اور بزمِ قدرت، ابر، ماہِ نو وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔ "گلِ رنگیں"[1] میں وہ سوال کر بیٹھتے ہیں:

اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں، میں سراپا سوزِ سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

غور و فکر اُن کے دل میں صوفیانہ خیالات پیدا کرتی ہے چنانچہ وہ اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے

اور اس طرح کے فکر انگیز نتائج تک پہنچنے میں وہ کامیاب ہوتے ہیں:

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوّت نہ ہو
رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو
یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یعنی مسلسل تلاش ایک ایسی شمع کی صورت ہے جو دنیا کو روشن رکھتی ہے اسی روشنی کی مدد سے انسان کی عقل آگے بڑھتی ہے۔

"ابرِ کہسار"[2] میں ابر اپنے متعلق نہایت خوبصورت زبان میں گفتگو کرتا ہے اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے:

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنّم میں نے
سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسّم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

---

[1] بانگِ درا ص ۶
[2] مخزن نومبر ۱۹۰۱ء بانگِ درا ص ۱۲

یہ نظم خود کلامی (SOLILOQUY) کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔

"شمع"[1] میں انسان اور شمع کا مقابلہ کرتے ہوئے بعض مفید نتائج اخذ کیے گئے ہیں جن سے اقبال کی طبیعت کی سادگی اور مزاج کی بے تعصبی کا پتا چلتا ہے:

کعبے میں، بتکدے میں ہے یکساں تری ضیا — میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

اس نظم کے آخری حصے میں انسان کے وجود کے سلسلے میں اقبال کچھ ایسے سوالات کرتے ہیں جو ہمیں غور و فکر کی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں:

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں — اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ! — بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ!
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں! — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں!
ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

"انسان اور بزمِ قدرت"[2] میں شاعر دنیا کی محفل میں سورج کو چمکتے ہوئے، گل و گلزار کو دمکتے اور لہکتے ہوئے، افق پر رنگا رنگ بادلوں کو تیرتے ہوئے اور شفق سے شام کو گل بداماں دیکھتا ہے تو غور و خوض کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور متفکر ہو کر اپنے آپ سے سوال کرتا ہے:

میں بھی آیا ہوں اسی نور کی بستی میں مگر — جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر؟
نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں — کیوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں؟

ابھی شاعر اپنے سوالات میں کھویا ہوا تھا کہ غیب سے ایک آواز آتی ہے جو انسانی خوبیوں اور عظمتوں کا اعتراف کرتی ہے:

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے — بار جو مجھ سے نہ اُٹھا وہ اٹھایا تو نے

اور انسانوں کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہوئے نظم اختتام تک پہنچتی ہے:

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے — نہ سیہ روز رہے پھر، نہ سیہ کار رہے

"ابر"[3] سات اشعار پر مشتمل یہ نظم بادل، بارش اور اس کے بعد پُر فضا اور دلفریب

---

[1] مخزن اپریل ۱۹۰۲ء بانگِ درا ص ۳۲۔
[2] مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء بانگِ درا ص ۴۵ [3] بانگِ درا ص ۹۲ ۱۹۰۸ء ایبٹ آباد

نظارے کی جلوہ گری کرتی ہے ملاحظہ کیجیے :

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے، اٹھے — زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اُٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اُڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا لو! برس پڑا بادل

زبان کی سادگی اور اظہار کی بے ساختگی بھی قابل توجّہ ہے۔

"ماہِ نو"[1] بھی مختصر لیکن اچھی نظم ہے، جس میں ہمارا شاعر ایک غیر ناطق سے اس کے متعلق استفسار حیرت سے کرتا ہے اور حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کا آرزو مند نظر آتا ہے :

قافلہ تیرا رواں بے منّتِ بانگِ درا — گوشِ انساں سن نہیں سکتا تری آوازِ پا
گھٹنے، بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو — ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو

"چاند"[2] میں بھی شاعر سوال کرتا ہے :

قصد کس محفل کا ہے؟ آتا ہے کس محفل سے تو؟ — زرد رو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو؟

پھر "چاند" اور "انسان" کا مقابلہ کرتے ہوئے، شاعر بتاتا ہے کہ چاند مجسّم نور ہے، انسان ظلمت یعنی خاکی ہے۔ انسان خالق کے دیدار کی آرزو میں جل رہا ہے لیکن چاند منّتِ خورشید کے داغ میں سراپا سوز ہے۔ چاند بھی زندگی کے راستے پر رواں ہے، انسان بھی، لیکن انسان کو حیرانی نصیب ہوئی ہے اس طرح دونوں کی مختلف خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعر دونوں کے وجود کے فرق پر انگلی رکھ دیتا ہے :

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو — سیکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دُور تو

ان نظموں کے علاوہ جگنو، کنارِ راوی، دردِ عشق، گلِ پژمردہ، موجِ دریا، خفتگانِ خاک سے استفسار وغیرہ اچھی اور فکر انگیز نظمیں ہیں، "جگنو"[3] میں پروانہ اور جگنو کے فرق پر فلسفیانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے :

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا — وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

---

[1] ۱۹۰۴ء بانگِ درا ص ۴۴۔
[2] جولائی ۱۹۰۴ء بانگ درا ص ۷۶۔
[3] بانگِ درا ص ۸۳

یا کنارِ راوی[1] کھڑے ہو کر زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یوں ہی
ابد کے بحر میں پیدا یوں ہی نہاں ہے یوں ہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا!

کبھی دردِ[2] عشق میں مضطرب نظر آتے ہیں، یہاں عشق سے شاعر کی مراد جذبۂ خدمت وایثار ہے جس کی اس دور میں قدر ختم ہو گئی تھی، چنانچہ وہ اپنے دور سے مضطرب ہو کر بے اختیار عشق سے ہم کلام ہو جاتے ہیں اور مشورہ دینے لگتے ہیں:

یہ دور نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

پوری نظم اسی لہجے کے ساتھ ہے اور فکر انگیز ہے۔

"گلِ پژمردہ[3]" سترہ اشعار پر مشتمل نظم تھی بانگِ درا کی اشاعت کے وقت صرف چھ شعر منتخب ہوئے۔ ایک مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھ کر اقبال پر جس قسم کے اثرات ہوئے انھیں نہایت دلنشیں انداز میں نظم کرنے کی انھوں نے کوشش کی ہے۔ شاعر کا خیال درست ہے کہ مرجھائے ہوئے پھول پر بلبل، صبا، نسیم، بادِ سحر، شبنم، شعاعِ مہر، تتلی وغیرہ کی نگاہیں اس لیے نہیں پڑتیں کہ مرجھایا ہوا پھول پھول نہیں ہوتا لیکن ہمارا شاعر واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کی نگاہ میں مرجھائے ہوئے پھول کی قدر ہے اس لیے کہ اسے دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے، وہ کہتا ہے:

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو[4]

"موجِ دریا[5]" چھ شعروں پر مشتمل ایک مختصر نظم ہے جس میں موج کے اضطراب کی وجہ دریا کی تنگی اور وسعتِ سمندر کی خواہش بتائی گئی ہے۔

"خفتگانِ خاک سے استفسار" میں اقبال کی حیثیت محض شاعر کی نہیں رہی ہے۔

---

[1] بانگِ درا ص ۹۶
[2] بانگِ درا ص ۳۹
[3] بانگِ درا ص ۴۱
[4] نوادراتِ اقبال ص ۲۱۰
[5] بانگِ درا ص ۴۲ (فروری ۱۹۰۲)

بیسویں صدی میں داخل ہوتے ہوتے ان کی فکر میں گہرائی پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ وہ فلسفی کا ذہن لے کر آئے تھے اس لیے قدم قدم پر غور و فکر میں مبتلا رہے، اس لیے بعض اوقات غیر ناطق کے منہ سے اپنی بعض الجھنوں کے جواب پیش کر دیتے یا کبھی اپنی الجھنوں کا اظہار کر بیٹھتے تھے۔

"خفتگانِ خاک سے استفسار" چالیس اشعار پر مشتمل ایک ایسی نظم ہے جس میں سے کل ۲۶ شعر بانگِ درا کے لیے انتخاب کیے گئے ہیں۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تمام الجھنیں اور پریشانیاں جن سے انسان دنیا میں نجات حاصل نہیں کر سکتا اور ساری زندگی اپنی آرزوؤں کو پوری کرنے کے لیے نبرد آزما رہتا ہے شاعر ان کے بارے میں ان خفتگانِ خاک سے سوال کرتا ہے جو منوں مٹی کے اندر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا استفسار عدم سے متعلق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح شاعر نے اس دنیا کے پریشان کن حالات بیان کیے ہیں:

اے عدم کے رہنے والو تم جو یوں خاموش ہو — مے وہ کیسی ہے، نشے میں جس کے تم مدہوش ہو؟
وہ ولایت بھی ہمارے دیس کی صورت ہے کیا — شب وہاں کیا ہے، صبح و شام کی رنگت ہے کیا؟
دل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے — اس ولایت میں بھی کیا مجبور کہتے ہیں اسے؟
واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں — اس ولایت میں بھی دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں؟
یہ خوشامد اس ولایت کا بھی کیا دستور ہے — واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے؟
واں کی عزت بھی، حکومت بھی حباب آسا ہے کیا — واں بھی یہ دولت ہی پیمانہ شرافت کا ہے کیا؟
آہ اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں — واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟
خرمنِ دہقاں کو ہے بجلی کا ڈر ایسا ہی کیا — اس جہاں میں ہے تبسم پر خطر ایسا ہی کیا؟
فکر انیٹوں کی وہاں بھی ہے مکاں کے واسطے[1] — تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟

یا

اس نگر کی طرح کیا واں بھی ہے رونا موت کا — کیا وہاں کی زندگی کو بھی ہے کھٹکا موت[2] کا

اقبال عمر کی جس منزل میں تھے اس میں یہ مسائل بھی ان کے سامنے تھے:

---

[1] سرودِ رفتہ ص ۱۰۰ [2] سرودِ رفتہ ص ۱۰۱

یاں تو چلمن کی جھلک سے اور بڑھ جاتا ہے شوق — کیا وہاں پر جلوۂ بے پردہ دکھلاتا ہے شوق[1]؟
حسن و خوبی ہو کے بے پردہ نظر آتے ہیں کیا — اس جہاں میں عشق کے ارماں نکل جاتے ہیں کیا؟

یا اس طرح کے سوالات بھی ان کے دل میں مچلتے ہیں:

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا — اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے، خرمن بھی ہے — قافلے بھی ہیں وہاں، اندیشۂ رہزن بھی ہے؟
واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا — امتیازِ ملّت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا؟
کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے — موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں، کیا راز ہے؟

اس نظم کو پڑھنے کے بعد پہلی بار ہمیں اقبال کی ذہنی الجھنوں، قلبی پریشانیوں اور اس کے اُس دور کے کرب و اضطراب کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس عمر میں جس میں انسان کے قریب کسی قسم کا غم نہیں پھٹکتا اقبال اس دنیا کے آلام سے مضطرب اور بے کیف نظر آتے ہیں۔

ان نظموں کے علاوہ بلال[2] سرگذشت آدم، نالۂ فراق اور زہد اور رندی بھی اہم نظمیں ہیں جن سے اقبال اور اقبال کی شاعری کی تہہ تک پہنچنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ بلال تاریخی نظم ہے۔ حضرت بلال کا جس انداز سے اقبال نے ذکر کیا ہے اُردو میں اس انداز فکر کی عام طور سے نظمیں نہیں ملتیں۔ سرگذشتِ آدم[3] ستمبر ۱۹۰۴ء کی نظم ہے جس کے ذریعہ روحانی اور سائنسی فتوحات پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال نے بتایا ہے کہ کامیابیوں کے باوجود زندگی کے راز سے آگاہی نہیں ہو سکی ہے:

مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہہ و نگیں میں نے

"زہد اور رندی"[4] میں اقبال نے نہایت دلچسپ انداز سے اپنا تعارف کرایا ہے جس سے اس بات کا بخوبی پتا چلایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں وہ کیا تھے یا اُن کے بارے

---

[1] سرود رفتہ ص ۱۰۱
[2] بانگِ درا ص ۷۸
[3] بانگ درا ص ۸۰
[4] بانگِ درا ص ۵۰

میں لوگ کیا سوچتے تھے۔ زبان نہایت سادہ اور رواں دواں استعمال کی ہے۔

"نالۂ فراق"[1] اپنے طرز کی انوکھی نظم ہے جس میں اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ کی جدائی میں عقیدت کے آنسو بہائے ہیں۔ ایسی نظم اردو میں نہیں ملتی، استاد سے ملاقات کی تڑپ ملاحظہ کیجیے:

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلّی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟
"تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

اس دور کی نظموں میں دو نظمیں "برگِ گل"[2] بر مزار مقدّس حضرت نظام الدین اولیا دہلی اور "التجائے مسافر"[3] کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ ان کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اقبال بزرگانِ دین سے کس قدر تعلق اور عقیدت رکھتے تھے۔ پہلی نظم برگِ گل، مخزن ستمبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم اقبال نے اس وقت کہی جب وہ اپنے بھائی شیخ عطا محمد کی پریشانی سے بے حد متردد تھے۔ بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ شیخ عطا محمد کے خلاف بعض دشمنوں نے فوجداری مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ اقبال نے یہ نظم اسی پریشانی سے نجات کے لیے مطبوعہ صورت میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر بھیجی تھی جو عرس کے موقع پر پڑھی گئی تھی جس کا یہ شعر:

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے — کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہربار سے

آج بھی مزار شریف کے دروازے پر تحریر ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے اقبال کے اس زمانے کی پریشانی اور اضطراب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

تاک میں بیٹھی ہے بجلی میرے حاصل کے لیے — ہیر ہے بادِ بہاری کو مرے گلزار سے

---

[1] بانگِ درا ص ۴۷

[2] سرودِ رفتہ ص ۵۲ ۔ [3] بانگِ درا ص ۹۷

آج کل اصغر جو تھے اکبر ہیں اور مولا غلام — ہیں مجھے شکوے ہزاروں چرخِ کج رفتار سے
کیا کروں اوروں کا شکوہ اے امیرِ ملک فقر — دشمنی میں بڑھ گئے اہلِ وطن اغیار سے
کہہ رہے ہیں مجھ کو پر بستہ قفس میں دیکھ کر — اڑ نہ جائے یہ کہیں پر کھول کر منقار سے
گریۂ شبنم پہ گل ہنستے ہیں کیا بے درد ہیں — وہ جو تھی بوئے محبت اُڑ گئی گلزار سے
گھات میں صیاد مائل آشیاں سوزی پہ برق — باغ بھی بگڑا ہوا ہے عندلیبِ زار سے
کہہ دیا تنگ آ کے اتنا بھی کہ میں مجبور تھا — خامشی ممکن نہیں خوگردۂ گفتار سے
سخت ہے میری مصیبت سخت گھبرایا ہوں میں — بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں[1]

دوسری نظم "التجائے مسافر" ہے۔ اقبال نے یہ نظم ۱۹۰۵ء میں اس وقت کہی جب وہ یورپ جا رہے تھے۔ اسے خود انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار مبارک پر پڑھا۔ اس نظم کے مطالعے سے جہاں اقبال کی حضرت نظام الدین اولیاؒ سے عقیدت مندی کا پتا چلتا ہے، اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ اپنے والدین، بھائی اور استاذ کے لیے نہایت پاکیزہ اور اچھے جذبات رکھتے تھے۔ یہ اشعار ان کے اسی قسم کے جذبات کے ترجمان ہیں:

پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنھوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی — رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی — بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں — کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو
وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمعِ محفلِ عشق — ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو[2]

اقبال کی یہ دعا بھی قابلِ توجہ ہے:

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو[3]

ان کے علاوہ کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں۔ جو دوسری زبان کے ادب سے ماخوذ ہیں، یہ بچوں کے لیے بھی ہیں اور بڑوں کے لیے بھی، عنوانات ملاحظہ کیجیے:

---

[1] نوادرِ اقبال: عبدالغفار شکیل ص ۲۵۲
[2] بانگِ درا ص ۹۸
[3] بانگِ درا ص ۹۸

ایک مکڑی اور مکھی	ماخوذ	MARY HOWITT
ایک پہاڑ اور گلہری	//	RALPH WALDO EMERSON
ایک گائے اور بکری	//	JANE TAYLOR
ہمدردی	//	WILLIAM COWPER
ماں کا خواب	//	
پیام صبح	//	LONG FELLOW
عشق اور موت	//	TENNYSON
رخصت اے بزم جہاں	//	RALPH WALDO EMESON

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مندرجہ بالا نظمیں جن شعرا کی نظموں سے ماخوذ ہیں ان سے اقبال نے بعد میں کبھی فیض اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ بالِ جبریل میں "گدائی"، "یورپ"، "شیر اور خچر" الوری، نیٹشے اور کسی جرمن شاعر سے ماخوذ ہیں اور ضرب کلیم میں "تقدیر" محی الدین عربی سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ اس دور کے بعد اقبال یورپ کا سفر کر آئے تھے اور استفادہ کرنے کے مواقع زیادہ پیدا ہو گئے تھے۔

ان میں بیشتر نظمیں بچوں کے لیے ہیں۔ اس دور کی یہ بھی ایک اہم خصوصیت ہے کہ علامہ اقبال نے بچوں کے لیے کئی نظمیں انھیں کی نفسیات کی روشنی میں، کسی قدر انھیں کی زبان میں کہنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لیے کہ وہ بچوں کے مزاج داں تھے، ان کی دلچسپیوں سے واقف تھے۔ قوم کے لیے ان کی اہمیت اور قدر و قیمت سے اچھی طرح آگاہ تھے، عہد طفلی، طفل شیر خوار، بچہ اور شمع، ان کی اسی قسم کی نظمیں ہیں جن سے ان کے بچوں کے مزاج سے آگاہی کا علم ہوتا ہے، ان میں سیدھی سادی زبان میں انھوں نے بچوں کی فطرت پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ایک مکڑا اور مکھی"، "ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ہمدردی، پرندے کی فریاد، ایک پرندہ اور جگنو وغیرہ خالص بچوں کے لیے نظمیں ہیں، جن کا مزاج سادہ، جن کی زبان سلیس اور عام فہم اور اسلوب دلنشیں ہے، ان کے موضوعات بچوں کے ذہن و فکر کی تعمیر کے لیے مفید ہیں۔

"ہندستانی بچوں کا قومی گیت" حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کرنے اور ہندستانیوں میں

اتحاد اور اتفاق قائم کرنے میں نہ صرف مدد کرتی ہے بلکہ ان بزرگوں کا احترام سکھاتی ہے، جنھوں نے ہم ہندستانیوں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ "بچے کی دعا" نہایت خوبصورت نظم ہے جس کے مطالعے اور جس کو سمجھنے کے بعد ایک بچہ آنے والے کل کے لیے نہ صرف ایک اچھا انسان ثابت ہو سکتا ہے بلکہ وطن کا شیدائی اور فدائی بننے میں فخر محسوس کر سکتا ہے۔ اقبال کی ان دونوں نظموں کو ہمیشہ سے مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس دور کے بعد اقبال بچوں کے لیے کوئی اور نظم نہ کہہ سکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑوں کے ذہن و دماغ کی تعمیر کی فکر میں بچے نظر انداز ہو گئے۔

اسی دور میں علامہ اقبال نے "اشکِ خوں"، "مرزا غالب"، "ماتم پسر" اور "داغ" جیسے شخصی مرثیے اور نوحے لکھے ان میں پہلا مرثیہ "اشکِ خوں" ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر لکھا گیا ہے۔

یہ شخصی مرثیہ نہایت اہم اس لیے بھی ہے کہ اقبال نے اس موضوع پر پہلی بار قلم اٹھایا تھا اور اس میں شک نہیں کہ اس قدر کامیاب قدم اٹھایا کہ آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ اردو میں اس طرح کے شخصی مرثیے بہت کم لکھے گئے ہیں۔ یہ کام اس لحاظ سے بھی بہت مشکل تھا کہ جس کا مرثیہ لکھا جا رہا تھا وہ ہندستان پر حکمراں رہ چکی تھی، اس لیے مرثیہ کا جائزہ لیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس وقت ہندستان کے سیاسی حالات کیا تھے۔ عمر کے لحاظ سے اقبال چوبیس سال سے زیادہ نہ ہوں گے، لیکن اس مرثیہ کے مطالعہ سے اُن کی وسعت نظری، قادر الکلامی، علمی اور فکری بلندی اور پختہ شعور کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ ایک سو دس اشعار پر مشتمل یہ مرثیہ ہر طرح قابلِ قدر ہے۔ ملکہ کی موت پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے وہ بادشاہت کی حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں اور اس کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

شاہی یہ ہے کہ اور کا غم چشم تر میں ہو — شاہنشہی یہ شان غریبی نظر میں ہو
شاہی یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو ہوں اور کے — چلّائے کون، درد کسی کے جگر میں ہو

پامالِ فکرِ غیر رہے تخت گاہ پر — آئے کسی پہ تیغ کسی کی سپر میں ہو
معمور ہو شرابِ محبت سے جامِ دل — جو دل میں ہو نہاں وہ نمایاں نظر میں ہو

بندِ ہفتم میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا رنگ غالب آگیا ہے:

ماتم میں آرہے ہیں یہ ساماں کیے ہوئے — داغِ جگر کو شمعِ شبستاں کیے ہوئے
تاریک ہوگیا ہے زمانہ مگر قضا — آجائے غم کی شمع فروزاں کیے ہوئے
رکھتا ہوں طائرِ دلِ رنگیں نوا کو میں — پہلو کو غیرتِ چمنستاں کیے ہوئے
لکھتا ہوں شعر دیدۂ خونبار سے مگر — کاغذ کو رشکِ بابِ گلستاں کیے ہوئے

غم میں شدّت، اظہار میں وقار، زبان میں سادگی، شستگی اور پاکیزگی، خیالات میں ندرت اور رفعت، جذبہ میں دردمندی اس مرثیہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ جوں جوں مرثیہ آگے بڑھتا ہے، ایک عجیب غمناک فضا تیار ہوتی چلی جاتی ہے، چند شعر پیش کرتا ہوں:

اے کوہِ نور لوٹنے جو دیکھے ہیں تاجور — دیکھا ہے اس طرح کا کوئی تاجور کہیں؟
دیتے ہیں بجھ کو دامنِ کہسار کی قسم — اس شان کا ملا ہے تجھے دادگر کہیں؟
بن کر چراغ سارے زمانے میں ڈھونڈنا — کہنا ہمیں بھی، آئے جو ایسا نظر کہیں؟

ہلتا ہے جس سے عرش یہ رونا اسی کا ہے — زینت تھی جس سے تجھ کو جنازہ اسی کا ہے

حالی نے بھی ملکہ کی موت پر مرثیہ لکھا تھا لیکن اقبال کی بات الگ کچھ اس لیے بھی ہے کہ ان کے یہاں جذبے پر فکر کی حکمرانی ہے، اس لیے اردو کے شخصی مرثیوں میں اس کی انفرادیت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

غالب پر اقبال کا مرثیہ "مرزا غالب" ستمبر ۱۹۰۱ء میں مخزن لاہور میں شائع ہوا تھا۔ غالب پر لکھے گئے بہترین مراثی میں اس مرثیہ کا شمار ہوتا ہے۔ اقبال، غالب کے قدرداں اور چاہنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ان کا اثر قبول بھی کیا ہے۔ ان سے متعلق اقبال کے خیالات ملاحظہ کیجیے۔ لب ولہجہ، رفعتِ تخیّل، اور زبان کی شیرینی نے کلام کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر — محوِ حیرت ہے ثریّا، رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر — خندہ زن ہے غنچۂ دلّیِ گلِ شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے — گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

گلشنِ ویمر میں غالب کے ہمنوا گیٹے کا ذکر کرکے صرف غالب کی تعریف نہیں کی گئی بلکہ

گیٹے کی قدر اقبال کے دل میں کتنی تھی، اس کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اقبال کی شاعری میں کسی غیر ملکی شاعر کا ذکر ملتا ہے۔ اس مرثیہ کے اس شعر:

گیسوے اُردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے　　شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی اس شعر کی سحر کاری وہی ہے جو ماضی میں تھی۔

"ماتم پسر"[1] کی حیثیت نوحہ کی ہے جسے اقبال نے اپنے دوست خواجہ عبدالصمد کے بیٹے کی موت پر تحریر کیا ہے، زبان سادہ، سلیس، اور پُر درد ہے لیکن بہت زیادہ غمناک نہیں ہے۔ باپ کے جذبات کی ترجمانی بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے:

اندھیرا صمد کا مکاں ہوگیا　　وہ خورشید روشن نہاں ہوگیا
بیاباں ہماری سرا بن گئی　　مسافر وطن کو رواں ہوگیا
گیا اڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا　　چمن پایمالِ خزاں ہوگیا
نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار　　نظر سے جو وہ گل نہاں ہوگیا

آخری تین اشعار میں غم کی انتہا ہے:

کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح　　کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہوگیا
غضب ہے غلام حسن کا فراق　　کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہوگیا
دیا چین کے وہ غم فلک نے مجھے　　کہ مُقبل سراپا فغاں ہوگیا

اس دور کے شخصی مرثیوں میں سب سے اہم مرثیہ[2] داغ کی وفات پر قلمبند کیا گیا ہے، داغ، اقبال کے استاد تھے، اس لیے اس مرثیے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ پورا مرثیہ غمناک جذبات سے بھرپور ہے، یہی مرثیے کی خوبی سمجھی جاتی ہے لیکن اقبال نے اس میں اپنی فکر کی بلندی سے بلندی اور عالمانہ وقار سے وقار پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے:

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے　　شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

---

[1] سرود رفتہ ص ۱۹۵
[2] بانگ درا ص ۸۹

بلبلِ دلّی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں

چل بسا داغ آہ! امیّت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

یا

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

یا

اٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بت خانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی، تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون

یا

آرزو کے خون رلوائی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیّادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوے گل کا باغ سے، گلچیں کا دنیا سے سفر

ان مرثیوں کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں شخصی مراثی کے مرثیے کو اقبال نے نہ صرف آگے بڑھایا ہے بلکہ اس میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر کے اس کی قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ کیا ہے تو یہ اقبال کی محض تعریف نہ ہوگی بلکہ حقیقت کا اظہار ہوگا۔

اقبال کی شاعری کے اس دور میں بعض ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کا ذکر میں نے اب تک نہیں کیا ہے۔ یہ وقتی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہیں اس لیے ان کی اقبال کی مذکورہ بالا شاعری کے مقابلے میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، البتہ اقبال کی شخصیت جاننے پہچاننے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ اقبال نے بانگِ درا میں ان نظموں کو شامل نہیں کیا ہے لیکن محققین کی نگاہوں نے انھیں ڈھونڈ نکالا، ایسی نظمیں حسب ذیل ہیں:

پنجۂ فولاد (سرودِ رفتہ ص ۲۳۸) ترجمہ از ڈائک (نوادر اقبال ص ۲۴۰) شکریۂ انگلستری (نوادر اقبال ص ۲۰۵ باقیات اقبال ص ۱۲۲) شیشۂ ساعت کی ریگ (سرودِ رفتہ ص ۸۶) قطعہ (باقیات اقبال ص ۱۲۲)۔ رباعی (اقبال اور انجمن حمایت اسلام ص ۸۱)۔ دلچسپ قطعہ تبرکات اقبال ص ۱۸ رباعی (تبرکات اقبال ص ۲۰)

اب اگر ہم مجموعی حیثیت سے غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبال بھی حالی کی طرح دردمند دل لے کر آئے تھے اور غالب کی طرح فلسفیانہ مزاج ان کے حصے میں آیا تھا، اس لیے انھوں نے ابتدا ہی سے اپنی شاعری کو وطن سے محبت کے لیے، عوام کی اصلاح کے لیے، بگڑوں کو سنوارنے کے لیے، زندگی کے راز کو سمجھنے کے لیے، کائنات پر پڑے پردوں کو اٹھانے کے لیے، حقائق کو پانے کے لیے، فطرت سے محبت کرنے کے لیے، قدرت سے رشتہ جوڑنے کے لیے، انسانی برادری کی فلاح و بہبود کے لیے، مختلف طریقوں سے مختلف موقعوں پر استعمال کیا ہے۔ وہ اس دور میں ایک اچھے انسان، ایک پسندیدہ شاعر، ایک مقبول اُستاد، اقتصادیات سے آگاہ، صوفیانہ خیالات کے حامل، حکیمانہ نظر کے مالک نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری شروع ہی سے مضبوط اور صحت مند بنیادوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اس لیے انھوں نے انھیں بنیادوں پر مختلف بنیادیں آگے چل کر رکھی ہیں۔ کہیں اضافہ کر کے کہیں تراش خراش کر کے اور کہیں نئے خیالات کو صیقل کر کے اور نئے اسلوب اختیار کر کے تاکہ ایک صحت مند معاشرہ کی تخلیق ہو سکے۔

اقبال کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری

اردو کے جن طنزیہ اور مزاحیہ شعرا کے نام عام طور سے لیے جاتے ہیں ان میں جعفر زٹلی، مرزا محمد رفیع سودا، انشاء اللہ خاں انشاء، شیخ غلام ہمدانی مصحفی اور نظیر اکبر آبادی کے نام اہم ہیں۔ جنھوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں سے اردو شاعری کے اس سرمایہ کو نمایاں اہمیت کا حامل بنا دیا لیکن ان تمام شعرا نے کسی خاص قومی یا ملی جذبے کے تحت اس طرح کی شاعری نہیں کی بلکہ حالات، وقتی ضرورت، بعض خاص واقعات یا احساسات سے مغلوب ہو کر طنز و مزاح کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اور اس طرح اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچایا تھا۔ یا محض طبیعت کی شوخی سے مجبور ہو کر اس طرح کی شاعری سے دلچسپی لی تھی، غالب کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے۔ انھیں حیوان ظریف کہا گیا ہے اور واقعی وہ اس نام کے مستحق تھے۔ انھوں نے نظم اور نثر دونوں میں اس فن کے نمایاں جوہر دکھائے اور نہایت پاکیزہ طنز و مزاح کی دولت سے اردو ادب میں اہم اضافہ کیا۔ غالب کا اس طرح کا کلام اور نثر پارے اردو طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے لیے سربلندی کا باعث بنے ہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ انیسویں صدی میں معیاری طنز و مزاح کی ابتدا غالب ہی سے ہوئی ہے تو اس صداقت کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت پڑے گی۔

لیکن اُنیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے خالص طنز و مزاح کا ایک اہم شاعر اپنے آپ کو اکبر الہ آبادی کے نام سے متعارف کراتا ہے جس کی لے نئی تھی جس کے موضوعات نئے تھے اور جو ہر اعتبار سے اپنے گذشتہ طنز و مزاح نگاروں میں منفرد آواز کے ساتھ ابھرا تھا۔ اس کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری ایک خاص مقصد کا احاطہ کرتی ہے اور ایک

دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری کے پیچھے اس کی اپنی ذات نہیں تھی اور نہ اس نے اپنی ذات کو تسکین پہنچانے کے لیے اس طرح کی شاعری کی، بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکست اور ہندستان کی پہلے سیاسی غلامی پھر تہذیبی، تعلیمی اور معاشی غلامی کے ردّعمل سے مضطرب اور قومی جذبے سے مجبور ہوکر اس کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک اہم مقصد کے لیے طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی شاعری کی ابتدا کی۔ اس طرح کی پوری شاعری مغربی اثرات اور مغلوبیت کے خلاف جہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ مغربیت کے خلاف اردو کے متعدد اہل قلم نے آواز بلند کی اور اپنی اپنی صلاحیتوں اور فکر و عمل کے ذریعہ ان کے اثرات کو کم کرنے اور اہل وطن میں ہمت اور حوصلہ پیدا کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ انھیں میں سے ایک اہم اور سب سے نمایاں نام اکبر الہ آبادی کا ہے۔ انھوں نے طنز و مزاح کے ہتھیار کی مدد سے مغربی یورش کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ زہریلے اثرات اور مہلک نتائج کو برسر عام پیش کرکے اہل ہند کو ان سے متنفّر اور وطن عزیز کے لیے متفکر کر دیا۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مغربی تعلیم، مغربی تہذیب، مغربی سیاست، مغرب کی غلامی اور اس کے خراب اثرات، بے حسی، بے عملی، بے کاری، مذہبی جھگڑے، فرسودہ رسوم، حکومت، حکمرانی اور نہ جانے کن کن پہلوؤں کو اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کا موضوع بنایا اور طنز و مزاح کے تیر و نشتر سے ان کی دھجیاں بکھیرنے اور مضرتوں سے آگاہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی اس طرح کی شاعری کا نشانہ تمام وہ افراد یا رجحانات یا اعمال بنے جن کو وہ ہندستان کے لیے یا اس مخصوص تہذیب، معاشرت اور مزاج کے لیے جن کے وہ پرستار تھے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ انھیں اپنے وطن سے محبت تھی، انھیں اپنی قوم سے گہرا تعلق تھا، انھیں اس تہذیب سے شدّت کے ساتھ لگاؤ تھا جس میں وہ پیدا ہوئے تھے، بڑھے تھے، پروان چڑھے تھے۔ وہ کسی قیمت پر اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے، چنانچہ ہر وہ چیز جسے انھوں نے وطن عزیز کے لیے نقصان دہ سمجھا اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور طنز و ظرافت کے تیر کی بوچھار شروع کر دی۔ طنز میں تلخی بھی ہے، اور تمسخر بھی جن کے ذریعہ وہ ہمیشہ مغربی تعلیم، تہذیب، سیاست اور اس کے اثرات کے خلاف آواز اٹھاتے رہے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ

بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، پڑھنے والے اور سننے والے دونوں نے ان کے دل کے اضطراب کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ ایک دنیا ان کے رنگ و آہنگ فکر و خیال سے متاثر ہوئی اور ان کی ہم خیال، ہم زبان، اور ہم نوا بنی۔ یہ ان کے کلام کا جادو ہی تھا کہ شاعر مشرق علامہ اقبال جیسا سنجیدہ مفکر اور فلسفی شاعر بھی ان کے رنگ میں رنگنے اور ان کے افکار کی پیروی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن قیاس ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد انھوں نے اکبری رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ وقت تھا جب اکبر الہ آبادی کی شہرت اور مقبولیت اپنی معراج کو پہنچ چکی تھی اور اقبال مخزن کے اوراق کے ذریعہ اور انجمن حمایت اسلام کے اسٹیج سے ابھی ابھی مملکتِ شہرت میں داخل ہوئے تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بھی اقبال نہ صرف اکبر کے کلام سے متاثر تھے بلکہ ان کی شخصیت بھی ان کے لیے محبوب بن چکی تھی۔ اس کا اندازہ اقبال کے اس انگریزی خطبہ سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۱۰ء میں اسٹریچی ہال علی گڑھ میں دیا تھا۔

اقبال کو اکبر سے جو عقیدت اور محبت تھی اس کا اظہار تقریباً اسی زمانے میں انھوں نے اکبر کے نام ایک خط مورخہ ۶ / اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اس طرح کیا تھا:

> "میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں[1]"

ظاہر ہے اقبال کو اکبر سے جو کچھ تعلق تھا اور ان کے دل میں اکبر کے لیے جس قسم کی عقیدت کے جذبات موجزن تھے، ان کی وجہ اکبر کا کلام اور ان کی یگانہ شخصیت تھی۔ اکبر قوم کے ہمدرد تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ اس دور میں جب وہ احساس کمتری اور گمراہی کی بدترین خرابی میں مبتلا تھی رہنمائی کریں۔ تاکہ وہ اس دلدل سے نکل کر زندہ قوموں کی طرح جینے کا حوصلہ کرے، چنانچہ اس کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے انھوں نے ظریفانہ

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۴۳۔

اسلوب اختیار کیا تھا اور ہنستے ہنساتے بے راہ رویوں سے بار بار آگاہ کرنے کی اس امید پر کوشش کی کہ اہل قوم میں ترقی یافتہ قوموں کی طرح جینے اور دوسروں کے لیے جینے کا سامان بہم پہنچانے کا رفتہ رفتہ حوصلہ پیدا ہو۔ اکبر کے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے اقبال نے بھی طنز و مزاح کا راستہ اختیار کیا اور اردو شاعری میں ایسے کلام کا اضافہ کیا جسے اکبری اقبال کا نام دیا گیا۔

لیکن یہ عجیب بات ہوئی کہ بعض حضرات نے اقبال کی اس رنگ کی شاعری کے خلاف آواز بلند کی اور اکبر کی شاعری سے اقبال کی شاعری کا موازنہ شروع کیا جس کا مقصد اقبال کی شاعری کی قیمت کو کم کرنا تھا۔ مخالفت کی آواز اکبر الہ آبادی کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے اقبال کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک خط ان کے نام تحریر کیا جس کا جواب اقبال نے ۱۶ر جولائی کو ان الفاظ میں دیا۔

> "حضرت! میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصول دولت و جاہ نہیں محض اظہارِ عقیدت ہے۔[1]"

اسی خط میں علامہ اقبال نہایت صاف لفظوں میں اکبر کا رنگ سخن اختیار کرنے کی وجہ اس طرح بتاتے ہیں۔

"عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کی داد دینا مقصود ہو اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بہ الفاظ دیگر اس کا تتبع کرے، اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ میں

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۴۰۔

نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان و بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ اس کے سوا کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔"

اکبر سے عقیدت اور محبت کی بنیادیں مضبوط تھیں، اس لیے کہ اس میں سچائی تھی، چنانچہ بعض لوگوں کی رکیک حرکتوں کے باوجود انھوں نے اکبری اسلوب سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ یہ سلسلہ کئی برسوں تک چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء میں ایسے کلام کو جو اکبر کے رنگ میں اقبال نے کہے تھے سولہ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ اکبری اقبال کے نام سے خواجہ حسن نظامی نے مرتب کر کے شائع کیا۔

دراصل اکبر اور اقبال کی قربت کی وجہ ذہنی اور فکری ہم آہنگی تھی۔ اکبر جن مقاصد کے حصول کے لیے شاعری کر رہے تھے، تقریباً وہی مقاصد اقبال کے تھے۔ دونوں وطن دوست اور اپنی قوم اور تہذیب کے شیدائی اور فدائی تھے۔ دونوں کو فرنگیوں کی بالادستی اور ہندستانیوں کی محکومی کا تلخ احساس تھا جس کی وجہ سے دونوں ایک خاص قسم کے کرب میں مبتلا تھے اور چاہتے تھے کہ ہندستانیوں کو احساس کمتری کی بدترین بیماری سے نجات دلا کر مغرب کے تمام برے اثرات سے محفوظ کر لیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دونوں نے طنز و مزاح کے ہتھیار استعمال کیے جس کے ذریعہ جہاں مغرب کے جادو کو بے اثر بنانے کی کوشش کی وہاں قوم میں جو کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ انھیں دور کرنے کی سعی جاری رکھی اور اس میں کوئی شک نہیں دونوں بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور ایک دنیا کو ہم خیال اور ہم نوا بنا لیا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اقبال سنجیدہ مزاج لے کر آئے تھے۔ مزاح کے ساتھ بہت دنوں تک نہیں چل سکے۔ ان کے آخری "اکبری رنگ" میں مزاحیہ کلام کی جو نشاندہی کی جا سکی ہے۔ وہ اکبر الہ آبادی کی موت کے بعد قطعہ کی صورت میں ہے۔ اکبر الہ آبادی نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو وفات پائی اس لیے یہ بات یقینی طور سے کہی جا سکتی ہے کہ تقریباً دس بارہ سال تک اکبر کے مزاحیہ رنگ میں اقبال نے شاعری کی۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی کبھار ذائقہ بدلنے کو اس طرح کی شاعری سے دل چسپی رکھتے ہوں لیکن اس کی نشاندہی نہیں کی جا سکی ہے۔ یا میری نظر سے ایسا کلام نہیں گزرا۔

اس مختصر مدت میں جو کچھ علامہ اقبال ظریفانہ کلام پیش کر سکے تھے وہ ادھر ادھر مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ البتہ اس کا ایک حصہ خود علامہ اقبال نے انتخاب کر کے بانگ درا کے آخر میں شائع کر دیا تھا۔ یہ بات بھی ہمارے لیے خوشی کی ہے کہ کلام کا وہ حصہ جو آہستہ آہستہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ اسے سید عبدالواحد، محمد الغزحارث، غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری، بشیر الحق دسنوی اور عبدالغفار شکیل نے اپنی اپنی مرتبہ کتابوں، باقیات اقبال، رخت سفر، سرودرفتہ، تبرکاتِ اقبال اور نوادرِ اقبال میں جمع کر دیا ہے۔ یا آج سے تقریباً ۵۶، ۵۷ سال پہلے اقبال کے ایک حیدرآبادی عاشق مولوی محمد عبدالرزاق نے ۱۹۲۴ء میں "کلیات اقبال" شائع کر کے اقبال کے اس کلام کو جسے انھوں نے اپنے مجموعہ بانگ درا میں بعد میں شائع نہیں کیا محفوظ کر لیا تھا، اس لیے آج اقبال کے کلام کے طنزیہ اور مزاحیہ رنگ کا مطالعہ کرنے میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ممکن ہے اب بھی اقبال کے اس رنگ کا کلام نظر سے اوجھل رہ گیا ہو اور محققین کی نگاہ تیز کا منتظر ہو۔

ان مجموعوں کے مطالعہ سے جہاں اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اقبال کا کلام ۱۸۹۳ء سے شائع ہونا شروع ہوا تھا اور انیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ان کے کلام کا مختصر حصہ منظر عام پر آچکا تھا وہاں اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں وہ کبھی مزاحیہ شاعری کی طرف رجوع نہیں ہوئے، البتہ بیسویں صدی کی ابتدا یعنی فروری ۱۹۰۲ء میں ایک طویل نظم "دین و دنیا" کہہ کر وہ اس رنگ کی طرف مائل ہوئے جو آگے چل کر "اکبری رنگ" سے جا ملتا ہے اور جس کا سلسلہ اکبر کی وفات کے بعد تک قائم رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے کسی وجہ سے اس حصے کو اپنے کلام سے نکال دیا ہوگا لیکن آج اس کا مطالعہ اقبالیات کے سلسلے میں دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ اس کے مطالعے سے اس زمانے کے افکار خیالات، جذبات و احساس اور اضطراب و انتشار کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عام طور سے اپنے اس طرح کے ظریفانہ کلام میں اقبال نے، پادری، شیخ، مولوی، چودھری، واعظ کے اعمال، زمانے کے طور، اس دور کی کشمکش، مسلمانوں کی خستہ حالی، ان کے ساتھ زیادتیاں ہندستان کے سیاسی حالات، ہندو مسلم اتحاد وغیرہ مختلف مسائل پر سے پردے اٹھائے ہیں۔ اور ان پر کبھی ہلکی کبھی تیز اور کبھی مضطرب کر دینے والی ضربیں لگائی ہیں اور اپنے طنز کو

مؤثر بنانے کے لیے فارسی اشعار کبھی ہندی الفاظ اور کبھی قرآن کی آیتوں کے برجستہ اور برمحل استعمال کیے ہیں اور کبھی جمن اور نصیبن جیسے فرضی کردار کے ذریعہ اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں کبھی اکبر کا رنگ جھلکتا ہے کبھی ان کا اپنا سنجیدہ طنز کا تیر چھبتا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں اصل میں بڑی دردمندی ملتی ہے۔ وطن سے، قوم سے، انسانوں سے محبت کا بے پناہ رشتہ مچلتا ہے، ان میں رہبری کی تڑپ محسوس ہوتی ہے اس سلسلے کی پہلی نظم " دنیا اور دین " ۴۵ اشعار پر مشتمل ہے جو نہایت سادہ زبان میں لکھی گئی ہے جس میں مولوی صاحبان کی کج فہمیوں اور کج ادائیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

اس طویل نظم کے علاوہ اور بھی حذف شدہ ظریفانہ کلام دستیاب ہوا ہے۔ جس میں اقبال کے دردِ دل کی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ناانصافیوں کے خلاف احتجاج؛ قوم کی بے راہ رویوں کے خلاف آواز، شیخ، مولوی، نیکی، برائی، ملک کی خراب حالت، اتحاد کا خواب اور دوسری ایسی باتیں ہیں جنھوں نے بڑی گرماگرمی پیدا کر رکھی تھی۔ اقبال مضطرب رہا کرتے تھے اور ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے وہ ہمیشہ فکرمند رہے۔

حذف شدہ ظریفانہ کلام کے علاوہ اس حصے میں بھی جو بانگ درا میں شامل کرلیا گیا ہے، اپنی تہذیب، تعلیم اور قوم و ملک سے گہرے تعلق کا اظہار اور نئی روش کے برُے نتائج کا خوف یا بیزاری کا احساس ملتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کے موضوعات زیادہ بہتر طریقہ سے پیش کیے گئے ہیں۔ ویسے سب ایک ہی انداز فکر اور جذبات کا نتیجہ ہیں۔ لڑکیوں کی انگریزی تعلیم، ہندستانیوں کی روشِ مغرب سے دلچسپی، وضعِ مشرق سے بیزاری، بے پردگی کے برُے نتائج، بے جا آزادی کی خواہش وغیرہ پہلے حصے سے غیر متعلق نہیں ہیں۔ لیکن وہی باتیں نئے ڈھنگ سے کہنے کی کوشش کی گئی ہے اور نتائج تک پہنچنے یا پالینے اور مقاصد کو حاصل کرلیتے ہیں کسی حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اقبال جس حد تک مغربی تہذیب کو ہندستانیوں کے لیے برا متصور کرتے تھے اس کے خلاف ان کے دل میں جس قسم کے جذبات پیدا ہورہے تھے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تہذیب سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مغرب کے حکمراں نہایت چالاک ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے ہندستانیوں کے ذہن صیقل کرکے نہ صرف اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں۔ بلکہ

انھیں اپنی تہذیب، تعلیم، مزاج اور حکومت کی محافظت کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے :

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ — نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

لیکن اقبال نے صرف مغربی تعلیم، تہذیب، معاشرت اور سیاست ہی کو اپنی اس طرح کی شاعری کا نشانہ نہیں بنایا ہے بلکہ اہل ہند کی خرابیوں اور برائیوں کی طرف بھی تیکھے اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ صنعت و حرفت میں ہندستان دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے اس قدر پیچھے کہ معمولی چیزوں کے لیے بھی اسے دوسروں کا محتاج رہنا پڑتا ہے۔ اقبال چونکہ علم معاشیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اس لیے ان کو اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر اس کمزوری پر توجہ نہیں کی گئی تو یہ ملک تباہی کے دہانے پر بہت جلد پہنچ جائے گا۔ چنانچہ وہ ہمیں اس خرابی اور کمزوری کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور ہماری کم مائیگی کا احساس دلاتے ہیں :

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک — چھتریاں، رومال، مفلر، پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی — آئیں گے غسّال کابل سے، کفن جاپان سے

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے :

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہنیگ

غالباً پہلی جنگ عظیم کا ابتدائی زمانہ ہوگا جب اقبال نے اپنے اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا جن کا براہ راست تعلق معاشیات سے ہے۔ ہمارے کتنے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی حب الوطنی کا اظہار اس انداز اور اس لہجے کے ساتھ کیا ہے!!

ہندستانیوں کی زندگی کے اس پہلو کا جس نے دوسروں کو محتاجی سکھائی ہے اقبال نے اس طرح بھی مذاق اُڑانے کی کوشش کی ہے کہ ہنسی بھی آتی ہے لیکن ہنسنے کو جی نہیں چاہتا، دوسرے ہی لمحہ بے چین کر دینے والی جبھن محسوس ہونے لگتی ہے :

وہ مس بولی ارادہ خودکشی کا جب کیا میں نے — مہذب ہے تو اے عاشق! قدم باہر نہ دھر حد سے
نہ جرأت ہے نہ خنجر ہے تو قصدِ خودکشی کیسا — یہ مانا درد ناکامی گیا تیرا گزر حد سے
کہا میں نے کہ اے جانِ جہاں کچھ نقد دلوا دو — کرایے پر منگالوں گا کوئی افغان سرحد سے

اقبال نے سرمایہ دار، بسوادار، مزدور، مزارع وغیرہ کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی ہے اور ان کی برائیوں پر مختلف زاویوں سے بھرپور طنز کے تیر چلائے ہیں اور وہ مقاصد جو پرجوش تقریروں اور لمبی چوڑی تحریروں سے حاصل نہیں کیے جا سکتے محض ہنستے ہنساتے حاصل کر لیے ہیں:

سنا میں نے کہ کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں — پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا — کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے — ماجرا اپنی ناتمامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو — صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوادار بے زحمت — پی گیا سب لہو اسامی کا

ہندستان اور یہاں کے رہنے والوں سے متعلق سیاسی، معاشی، فکری، مذہبی، معاشرتی اور نہ جانے کن کن پہلوؤں کے مذموم گوشوں کو اقبال نے نمایاں کرنے اور ان کی خرابیوں سے باخبر کرنے کی دلچسپ پیرایے میں کوشش کی ہے۔ مزاحیہ کلام کے اس حصّے میں شیخ اور واعظ بھی ہیں، ہندو اور مسلمان بھی ہیں ملکی سیاست بھی ہے، بیرونی چالبازیاں بھی ہیں۔ اقبال سب کی موقع موقع سے اس طرح نقاب کشائی کرتے ہیں کہ سامع یا قاری اقبال کے دل کی بات پالیتا ہے۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو جاتی ہے اور پھر تلخ سنجیدگی طاری ہو جاتی ہے۔ اقبال کے ظریفانہ کلام کے اس حصّے پر اکبری رنگ غالب ہے۔ اکبری فکر کی پرچھائیں ہے اور اکبری جذبے کی کارفرمائی بھی۔ اقبال نے اپنے اس فن کو کامیاب بنانے کے لیے کبھی انگریزی اور کبھی ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں، کبھی گائے، اونٹ اور مچھر سے اپنی بات سمجھانے میں مدد لی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس قدر سنجیدہ شاعر ہونے کے باوجود بڑی حد تک اس میدان میں بھی پورے اُترے ہیں اور مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

بانگِ درا کے ظریفانہ کلام کے اس حصّے کے علاوہ تین مزید نظمیں "زاہد اور رندی" "نصیحت" اور "دریوزۂ خلافت" اگرچہ اس رنگ کی نہیں ہیں لیکن سادہ طنز کی وجہ سے وہی کام کرتی ہیں جو اقبال کے ظریفانہ کلام نے کیا ہے۔

ان کے علاوہ اقبال کی غزلوں میں طنزیہ اشعار ملتے ہیں جن میں اقبال خاص طور سے واعظوں کو اپنی ملامت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اقبال نے ان کے خلاف تقریباً وہی الزامات لگائے ہیں جن کے لیے اردو شعرا انھیں بدنام کرتے رہے ہیں۔ ان میں اقبال کی کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی۔ البتہ ان کی نظم "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں تیکھے طنز کی اچھی مثالیں ملتی ہیں جن کی چبھن دیر تک محسوس کی جاتی ہے۔ ان نظموں میں طنز کی آمیزش نے حصول مقصد میں اقبال کی بڑی مدد کی ہے، ان کے بند کے بند آج بھی اسی تیکھے لہجے کے ساتھ مختلف موقعوں پر استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ شاعر کے مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔

اب تک اقبال کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کے جس حصّے سے بحث کی گئی ہے اس میں ۱۹۲۴ء سے پہلے کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس دور کے اقبال کے سنجیدہ کلام کا اگر جائزہ لیا جائے تو جہاں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس وقت تک اقبال کی شاعری فکر کی مختلف منازل اور اور تجربے سے گزرتی ہے۔ وہاں یہ بات بھی یقینی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کی زندگی کی ابتدائی طویل عمر یعنی تقریباً پچاس سال تک کی شاعری "بانگِ درا" میں محفوظ ہوگئی ہے، اس لیے اس میں جذبات کی فراوانی ہے، موضوعات کی رنگارنگی ہے مختلف زاویوں سے وطن سے محبت کا اظہار ہے۔ اسلام سے گہرا تعلق ہے اور جہاں ہندستان کے روشن مستقبل کی تلاش ہے وہاں مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا غمناک احساس اور انھیں تباہی سے محفوظ رکھنے کی فکر اور ان میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کا عزم وحوصلہ ملتا ہے۔ اس دور کی شاعری میں اندرونی یا بیرونی سیاست کا بہت کم دخل ہے۔ البتہ مغرب کے تسلّط کا شدید احساس ہے اور ان کے بُرے منصوبوں سے ہندستان کو بچا لینے کی فکر ہے۔ اسی قسم کے بعض پہلوؤں پر اقبال نے اپنے طنزیہ اور مزاحیہ کلام میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہاں بھی اقبال کے وہی جذبات اور مقاصد ہیں جو بانگِ درا کی سنجیدہ شاعری میں کام کرتے ہیں۔

یہ بات بھی بہت حد تک صاف ہے کہ بانگ درا میں جو طنزیہ اور مزاحیہ کلام شائع ہوا

ہے اس کا بڑا حصّہ "اکبری رنگ" میں رنگا ہوا ہے۔ اقبال نے پوری کوشش کی تھی کہ اکبری رنگ کی تقلید کریں اور انہی کے لب ولہجہ، مزاج اور آہنگ کو اختیار کریں لیکن وہ اپنے فلسفیانہ مزاج، سنجیدہ افکار، اور عالمانہ لہجے کی وجہ سے اسے پیش کرنے میں بہت کامیاب نہیں ہو سکے جس کا احساس خود انھیں بھی تھا۔ چنانچہ ایک خط بنام مہاراجا سر کرشن پرشاد شاد (۷ مارچ ۱۹۱۴ء) میں انھوں نے تحریر کیا تھا۔

"مولانا کا خط کل آیا تھا خیریت سے ہیں ان کا دم بھی غنیمت ہے خدا انھیں خوش رکھے۔ میں نے ان کے رنگ میں چند اشعار لکھے تھے۔ مگر وہ بات کہاں [1]"

اس خط سے یہ خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ مارچ ۱۹۱۴ء سے پہلے ہی علامہ اقبال نے اکبری رنگ سے بے تعلقی اختیار کر لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس قدر اس رنگ کو اختیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، اسے اکبر الہ آبادی کی وفات کے بعد کچھ نہ کچھ قائم رکھا۔ اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس ظریفانہ رنگ کو ترک کر دیا۔ البتہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے خالص طنزیہ شاعری کو جاری رکھا چنانچہ بالِ جبریل کی غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیوں کی صورت میں ایسے اشعار بکھرے پڑے ہیں جو ایک اچھے طنز نگار اقبال سے متعارف کراتے ہیں۔ اس دور کی غزلوں میں انھوں نے صوفی، ملّا، زاہد، حکیم، پیرِ حرم فقیہہ شہر، فلسفی، نمازی، خواجگی قیصری، فرنگی، مہاجن اور تہذیب حافر وغیرہ کو اپنے طنز کی تیزی دکھانے کے لیے استعمال کیے اور کامیاب ہوئے، کہیں کہیں بارگاہ خداوندی میں شوخی سے بھی کام لیا ہے۔ لیکن یہ شوخی اقبال کے علاوہ کسی اور کی زبان سے اچھی نہیں لگ سکتی تھی ملاحظہ کیجیے:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟ مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

---

[1] صحیفہ اقبال نمبر ص ۱۱۴ بحوالہ اکبر اور اقبال از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۹۱۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

شوخی اور طنز کا یہ راستہ جو اقبال نے اختیار کیا تھا، نہایت مشکل، دشوار گزار اور پرخطر تھا۔ شکوہ کے بعض حصّے میں اس طرح کی شوخی نے کتنوں کو برہم ہی نہیں کیا غضب ناک کر دیا تھا، لیکن اقبال کی حکیمانہ اور عالمانہ فکر و شعور نے کامیابی کے ساتھ ہی انھیں اس راہ سے نہیں گزار دیا بلکہ اردو شاعری کے خزانے میں قابل فخر اضافہ کیا اور اس کے پیچھے جو اصلاحی مقاصد اقبال لے کر چلے تھے اس کے حصول میں وہ اس لیے کامیاب نظر آئے کہ اہل دل اسے پڑھ کر تڑپ گئے۔ بالِ جبریل میں بعض نظمیں "گدائی"[1] اور "ملّا اور بہشت"[2] پنجاب کے پیرزادوں کے نام "سیاست خانقاہ" "ابلیس کی عرض داشت" "باغی مرید" وغیرہ اقبال کی طنزیہ شاعری کے لیے مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں، جن میں اقبال نے قومی اصلاح کے لیے سنجیدگی کے ساتھ سادہ زبان، دھیمے لہجے اور عالمانہ انداز میں طنز کے وار کیے ہیں اور ان برائیوں کو طشت از بام کیا ہے جن کی وہ اصلاح چاہتے تھے اور اس میں شک نہیں ایک دنیا کو وہ ان خرابیوں کی طرف متوجہ کرنے میں اور ان کی اصلاح کا احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ملاحظہ کیجیے۔ وہ میر و سلطان کے بارے میں اس طرح دو ٹوک رائے کا اظہار کرتے ہیں:

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا[1]

اور نئے زاویے سے ملّا کو یوں ہدف بناتے ہیں:

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا اور جنّت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت[2]

اور پیر کے خلاف اس کے مریدوں کو بغاوت پر اس طرح آمادہ کرتے ہیں:

---

[1] گدائی بال جبریل ص ۱۸۵۔
[2] ملّا اور بہشت: بال جبریل ص ۱۵۹۔

ہم کو تو میسّر نہیں مٹّی کا دیا بھی گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن[1]

یہ تمام اشعار اور نظمیں اقبال کے اس مجموعۂ کلام میں ہیں جس میں ان کی فکری بلندی اور فنّی پختگی معراج کو پہنچ گئی ہے۔ اس لیے یہ اشعار اثر و تاثیر کا مرقّع ہیں اور میرے خیال میں اردو کے بہترین طنزیہ سرمایہ کے پہلو بہ پہلو رکھے جا سکتے ہیں۔

اقبال کا اردو میں آخری شعری مجموعہ جو ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا "ضربِ کلیم" ہے، جسے علاّمہ اقبال نے "دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ" کا نام دیا ہے اور جس کے ذریعہ "خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر" پیغام ہم تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس مجموعے کو بھی بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگرچہ اس کی نظموں میں فکر بھی ہے اور جذبہ بھی ہے۔ لیکن بالِ جبریل کی طرح نہ اس میں فکر کی اتنی گہرائی ہے اور نہ جذبہ کی فراوانی۔ اس کے باوجود اس مجموعے کی اہمیت اس کی بعض نظموں کے طنزیہ لہجے نے بڑھا دی ہے۔ اس مجموعے میں ایسی نظمیں زیادہ ہیں جن میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ سنجیدہ طنز بھی کرتے ہیں۔ ان میں کچھ تو وہی مسائل یا ہماری زندگی کے تاریک گوشے ہیں جن کی وجہ سے اقبال متفکّر رہا کرتے تھے۔ لیکن بعض نئے ہیں اپنے ملک اور سماج کی بے بصری سے متعلق ہیں، کچھ کا تعلّق بیرونی ہند سے ہے۔ جب اقبال حقوقِ انسانی کے پامال ہونے سے تڑپ اٹھتے ہیں، اس زمانے تک اقبال ملکی سیاست میں بھی داخل ہو چکے تھے اور دوسرے ملکوں کی سیاست پر بھی نظر رکھنے لگے تھے۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں دو بار انھیں بیرونِ ہند کا بھی سفر کرنا پڑا تھا۔ اور مختلف تجربوں سے گزرنا پڑا تھا۔ ان کے اثرات بھی ان کی اس دور کی شاعری پر نظر آتے ہیں۔ بعض تجربات انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے موضوعات کو جب وہ اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں تو ان کے اسلوب کی نرمی اور شیرینی، سختی اور تلخی میں بدل جاتی ہے اور طنز کی صورت اختیار کر جاتی ہے، ایسا طنز جس سے ہلکی زیرِ لب مسکراہٹ پیدا ہو جاتی ہے یا سخت بے چینی اور بے کیفی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ کیفیت دیر تک اپنا اثر قائم رکھتی ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ خالص طنز کے بہترین نمونے "ضربِ کلیم" میں ملتے ہیں تو اسے ماننے

---

[1] باغی مرید: بالِ جبریل ص ۲۱۹

سے کون انکار کرے گا۔ ضربِ کلیم میں ایسی نظمیں بیس[۲] بائیس[۲۲] ہیں جن میں سے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند[۱]

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام[۲]

اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ انگریز — سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام[۳]

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بیکار و زن تہی آغوش[۴]

معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت — کہہ دے کوئی الّو کو اگر رات کا شہباز[۵]

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ — مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس[۶]

ان چند مثالوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت علامہ کس کس زاویے سے زندگی کے کن کن پہلوؤں کو نشانہ بنا رہے تھے اور اپنی زندگی کے آخری ایام میں کس طرح کی کشمکش میں مبتلا تھے، بانگ درا کے بعد بالِ جبریل کی اشاعت تک انھیں تیرہ چودہ سال کی مختصر مدّت ملی جس میں وہ اپنی زندگی کو مختلف تجربوں سے گزارتے

---

[۱] شکر و شکایت: ضربِ کلیم ص ۱۵۔
[۲] توحید: ضربِ کلیم ص ۱۸۔
[۳] اشاعتِ اسلام فرنگستان میں ضربِ کلیم ص ۶۰۔
[۴] ایک سوال: ضربِ کلیم ص ۱۰۱۔
[۵] خوشامد: ضربِ کلیم ص ۱۴۰۔
[۶] سیاستِ افرنگ: ضربِ کلیم ص ۱۴۴۔

رہے اور کبھی سنجیدہ اور کبھی طنزیہ کلام کی شکل میں اسے عوام تک پہنچاتے رہے جس نے ایک مدّت تک اردو والوں کو اپنی طرف متوجہ اور متاثر کیے رکھا۔ اقبال کی پوری شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کی آخری دور کی شاعری اس لیے بہت اہم ہے کہ قاری یا سامع اسے پڑھنے یا سننے کے بعد محض واہ وا نہیں کرتا بلکہ آہ آہ کی منزل سے بھی گزرتا ہے۔ لیکن یہ آہیں محض وقتی نہیں ہوتیں بلکہ دیر پا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اس لیے آج یہ کہنا بجا ہے کہ اقبال کی وہ ظریفانہ شاعری جو ۱۹۰۲ء میں "دین و دنیا" کی صورت میں شروع ہوتی ہے جس میں ہلکی سی تمسخر کی کیفیت بھی ہے۔ دس بارہ سال کے لیے "اکبری رنگ" اختیار کرتے ہوئے خالص طنز میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا سلسلہ ان کی زندگی کے تقریباً آخری دم تک رہتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا جائے کہ آخری زمانے کی شاعری کا خالص طنزیہ حصّہ ان کے ابتدائی ظریفانہ کلام کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہے تو یہ بات اور زیادہ صحیح ہوگی۔

بچّوں کا اقبال

علاّمہ اقبال اردو کے ان خوش نصیب شاعروں میں ہیں جنھوں نے اِدھر شاعری کی ابتدا کی، اُدھر شہرت اور مقبولیت ان کے قدم چومنے لگی اور وہ رفتہ رفتہ عزّت، احترام اور ہر دلعزیزی کی اس منزل پر جا پہنچے جہاں اب تک اردو کے کسی دوسرے شاعر کی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ وہ خدا شناس تھے، کائنات کی حقیقت سے آگاہ تھے، آدم کے رازداں تھے، انسان دوست تھے، عاشقِ رسول تھے، اسی لیے پیغمبرانہ شان سے شاعری کی اور آدمِ خاکی کو اس کی عظمتوں سے آگاہ کرکے، اسے اعلا مقام حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ پوری شاعری کا مطالعہ کیجیے تو محسوس ہوگا کہ وہ ایسے انسان کامل کو وجود میں لانا چاہتے تھے، جس کے کردار، گفتار، عزائم اور حوصلہ کی وجہ سے اسے مردِ مومن کا درجہ عطا ہو، اور جو دنیا کو بنانے، سنوارنے اور نکھارنے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے سکے ان کی شاعری کے پیچھے ان کے احساسات تھرتھراتے ہیں، جذبات مچلتے ہیں، افکار جھلکتے ہیں، اور وہ سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اقبال ایک ایسی دنیا کی تخلیق کے خواہش مند تھے جو جنّت نظیر ہو اور اس کے باشندے دلفریب ادا، دلنواز نگاہ اور قلیل امیدوں کے ساتھ عظیم مقاصد کے حاصل کرنے میں منہمک ہوں۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصّہ ایسے ہی انسان کی تلاش میں نغمہ سرا ہے۔

اقبال کی شاعری کی انھیں خصوصیات نے اردو دنیا کے اہلِ دل، اہلِ نظر اور

صاحبِ فکر حضرات کو اپنی طرف متوجّہ کیا، جنھوں نے ان کی شاعری سے اپنے قلب کو گرمایا، روح کو تڑپایا، نظر کو چمکایا، اور ذہن کو صیقل کیا۔ اقبال کی اسی مقبولیت نے ہزاروں اہل قلم کو ان کا گرویدہ بنالیا، چنانچہ انھوں نے ان کی شاعری کی مختلف خصوصیات، مختلف پہلوؤں، مختلف امکانات کو جاننے کی اور مختلف سمتوں کو پہچاننے کی طرح طرح سے کوششیں کیں، جن سے اقبال شناسی میں اقبالیئن کو بڑی مدد ملی۔ بے شک آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بہت حد تک اقبال کو ڈھونڈ لیا ہے، جان لیا ہے، پہچان لیا ہے، اور ان کی عظمتوں کو پالیا ہے۔ اس سلسلے میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہزاروں مقالات سپردِ قلم کیے گئے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ اور زیادہ زور و شور اور تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے لیکن اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے پہلوؤں پر بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے، خاص طور سے اقبال کی ابتدائی شاعری کا پوری طرح سے جائزہ لینا ابھی باقی ہے۔ انھیں میں اقبال کی وہ شاعری بھی ہے جو انھوں نے محض بچّوں کے لیے کی تھی۔ اس طرح کی نظمیں اقبال نے بہت زیادہ نہیں کہی ہیں۔ بانگ درا کے پہلے حصّے میں کل نو نظمیں ہیں جن میں "ایک مکڑا اور مکھی" "ایک پہاڑ اور گلہری" "ایک گائے اور بکری" "ہمدردی" "ماں کا خواب" "پرندے کی فریاد" "بچے کی دعا" بچوں کے لیے ہیں۔ "ایک پرندہ اور جگنو" اگرچہ اس پر بچّوں کے لیے لکھا ہوا نہیں ہے لیکن بچّوں کے لیے ہے اور اسی لیے بچّوں کی درسی کتابوں میں اسے درج کیا جاتا رہا ہے۔ "ہندستانی بچّوں کا قومی گیت" بھی بچّوں کے لیے ہی ہے۔ بچّوں کے حصّے میں اقبال سے بس یہی کچھ ملا ہے۔

ان کے علاوہ "عہدِ طفلی" "بچہ اور شمع" اور "طفلِ شیر خوار" کے مطالعے سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال کو بچّوں سے یا بچپن سے کس قدر گہرا لگاؤ تھا، اور بچپن کا زمانہ کس قدر عزیز تھا۔ ان تمام نظموں کا تعلق اقبال کی شاعری کے پہلے دور سے ہے یعنی یہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء کے دوران میں لکھی گئی ہیں، اس کے بعد اقبال نے بچّوں کی طرف پھر کبھی توجّہ نہیں کی۔ البتہ نوجوانوں کی رہنمائی کرتے رہے اور انسان کامل کی جستجو میں کھو گئے۔

اردو میں بچّوں کا ادب توجہ طلب ہے، خاص طور سے شعرا نے اس طرف بہت

کم توجہ کی ہے، اقبال سے پہلے نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے اس طرف توجہ کی تھی، پھر اسماعیل میرٹھی، نے بچوّں کے ادب کے سلسلے میں بڑا نام پیدا کیا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی بچّوں کو یاد رکھا، اقبال کے ہم عصروں میں مولانا محوی صدیقی، مولانا شفیع الدین نیرّ اور حامد اللہ افسر وغیرہ نے بھی بچوں کے ادب میں کافی اضافہ کیا اس لیے بچوں کے ادب کے سلسلے میں بھی ان حضرات کا نام برابر لیا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال نے بچوّں کو بہت کچھ نہیں دیا، لیکن جتنا کچھ دیا ہے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کو اگرچہ بچپن کا زمانہ بہت عزیز رہا ہے لیکن حالات نے اس کی طرف توجہ کرنے کا موقع بالکل نہیں دیا، ان کی دو تین نظمیں ایسی ملتی ہیں جن میں بچپن کا ذکر نہایت دلچسپی کے ساتھ کیا گیا ہے جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچّوں اور ان کی نفسیات پر اقبال کی کتنی گہری نظر تھی۔ اس سلسلے کی پہلی نظم "عہد طفلی" ہے[1] جو پہلی بار جولائی ۱۹۰۱ء میں مخزن لاہور میں شائع ہوئی تھی اور جسے مولوی عبدالرزّاق نے اپنی مرتبہ کلیاتِ اقبال میں شامل کر لیا تھا۔ اس میں کل پانچ بند یعنی پندرہ شعر تھے۔ بانگ درا میں شائع کرتے وقت علاّمہ اقبال نے اس کے کل دو بند (تیسرا اور چوتھا) یعنی چھے شعر انتخاب کیے تھے اور اس کے بھی بعض مصرعوں میں اصلاح کر دی تھی۔

ملاحظہ کیجیے:

تیسرے بند کا چوتھا مصرع پہلے یوں تھا۔ ع

خالی از مفہوم خود میری زباں میرے لیے (کلیات اقبال ص ۱۲۳)

بانگِ درا میں اقبال نے اسے اس طرح کر دیا ہے ع

حرف بے مطلب تھی خود میری زباں میرے لیے (بانگِ درا ص ۸)

تیسرے بند کا پانچواں مصرع اس طرح تھا۔ ع

درد اس عالم میں جب کوئی رلاتا تھا مجھے (کلیات اقبال ص ۱۲۳)

---

[1] کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزّاق ص ۱۲۲۔

بانگ درا میں اس طرح ہے۔ ع

دردِ طفلی میں اگر کوئی رُلاتا تھا مجھے (بانگ درا ص ۸)

چوتھے بند کا چھٹا مصرع اس طرح تھا۔ ع

دل مرا جام شرابِ ذوقِ استفسار تھا (کلیات اقبال ص ۱۲۲)

بانگ درا میں اصلاح کے بعد اس طرح ہے ع

دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا (بانگ درا ص ۸)

حذف شدہ ابتدائی دو بند یہ ہیں:

ہاں اٹھا اے ساحرِ ایّام یہ جادو ذرا ابلقِ گردوں نہ ہوں محوِ رمِ آہو ذرا
ہائے پھر آجا کہیں سے عمرِ رفتہ تو ذرا لا وہ نظارہ پئے چشمِ تماشا جو ذرا

خون رلواتے ہیں ایّامِ جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وہی ایّامِ طفلی کے مزے

ہائے وہ عالم کہ عالمگیر تھی اپنی ادا غیرتِ صد فصلِ گل تھی اپنے گلشن کی ہوا
مکتبِ طفلی میں غیر از درس آزادی نہ تھا رنگِ افکارِ جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا

مایہ دارِ صد مسرت اک تبسّم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر وہ تکلّم تھا مرا

آخری بند یہ ہے:

آہ اے دنیا نمک پاشِ خراشِ دل ہے تو جس کے ہر دانے میں سو بجلی ہے وہ حاصل ہے تو
جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تو جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو وہ محمل ہے تو

میرے ہاتوں کوئی جو پالے مئے تسکین نہ ہو
ایمن از مارِ زمینِ گلستانِ گلچیں نہ ہو

(کلیات اقبال ص ۱۲۲-۱۲۳)

پوری نظم کچھ اس طرح ارتقائی منزل طے کرتی ہے۔

پہلے بند میں "ساحرِ ایّام" سے مخاطب ہو کر "عمرِ رفتہ" کو یاد کرتے ہیں اور اس نظارے کی آرزو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خون رلواتے ہیں ایّامِ جوانی کے مزے لا کہیں سے پھر وہی ایّامِ طفلی کے مزے

دوسرے تیسرے اور چوتھے بند میں بچپن کیا ہے اور معصوم بچہ کیا ہوتا ہے، اس کی نہایت دلکش تصویریں پیش کی گئی ہیں جن میں بچّے کی معصومیت اس کی بھولی بھالی ادائیں، اس کا رونا، ہنسنا، مسکرانا، حیرت زدہ ہونا، بچھڑ جانا، بہل جانا وغیرہ کے حسین پیکر تراشے گئے ہیں، ان کے مطالعے سے قاری کو بچپن کی یاد بھی آتی ہے اور بچّے کے لیے پیار کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کیسی کیسی تصویریں نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتی ہیں:

ع مکتبِ طفلی میں غیر از درس آزادی نہ تھا
ع وسعتِ آغوش مادر ایک جہاں میرے لیے
ع تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر
ع اور وہ حیرت دروغ مصلحت آمیز پر

ے مایہ دارِ صد مسرت اک تبسّم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر وہ تکلّم تھا مرا

ے درد اس عالم میں جب کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

اور آخری بند میں شاعر نے دنیا اور اس کی پریشانیوں کا نہایت غمگین لہجے کے ساتھ اظہار کیا ہے، اس نظم کی زبان سادہ اور سلیس ہونے کے بجائے مشکل ہے خیالات میں اگرچہ پیچیدگی نہیں ہے، لیکن روانی بھی نہیں ہے۔ ان میں سے بانگ درا کے لیے دو بند منتخب ہوئے ہیں، وہ یقیناً اچھے ہیں۔ جن میں "عہدِ طفلی" کو مختصر طور پر پیش کرنے میں یقیناً کامیابی ہوئی ہے۔

دوسری نظم "طفل شیر خوار" ہے جو ستمبر ۱۹۰۵ء میں مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ کلیاتِ اقبال[۱] میں انیس[۱۹] اشعار پر مشتمل ہے، بانگ درا میں آٹھ شعر حذف کر دیے گئے ہیں اور گیارہ شعر کا انتخاب کیا گیا ہے۔ دو شعروں میں اصلاح ہے ملاحظہ کیجیے:

لہ کلیات اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق ص ۴۰۔

اصلاح شدہ اشعار:

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاّتا ہے تو — مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو
(کلیات اقبال ص ۴۰)

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو — آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو
(کلیات اقبال ص ۴۱)

حذف شدہ اشعار:

ایسی چیزوں کو جو تو سمجھا ہے سامانِ خوشی — کیا کسی دکھ درد کے مکتب کی ابجد ہے یہی
درد سے اے نوا سیرِ حلقۂ گردابِ درد — ہو تو جائے گی تجھے آگاہی اسبابِ درد
اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بے تابی ہے کیا — اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا
ہے تجھے کچھ فرش پر اس کے گرانے کا مزا — ٹوٹ جائے آئینہ میرا تجھے پروا ہے کیا
تالیوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی — مل گئی جو شے تجھے تیرا کھلونا بن گئی
جو تیری آنکھوں کے آگے ہو ہوس انگیز ہے — یعنی ہر شے تو سنِ ادراک کو مہمیز ہے
پھوٹتی ہے فصلِ گل کی جس طرح پہلے کلی — منہ پہ ڈالے سبز پتّے کی نقابِ عارضی
یوں ترے ہنسنے سے دل میں ہے تمنا کی نمود — اے گل وشگفتہ صحن چمن زار وجود[1]

اس نظم میں شاعر بچّے سے سوال کرتے ہوئے اس کی طبیعت کی سادگی اور مزاج کی معصومیت پر روشنی ڈالتا ہے، وہ اس سے پوچھتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ تجھ سے چاقو چھینتا ہوں تو تو روتا ہے اور اپنے مہربان کو نامہربان متصوّر کرتا ہے حالانکہ اس طرح کی چیزیں خطرناک ہوتی ہیں:

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاّتا ہے تو — مہرباں ہوں میں مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

بچہ قلم کے لیے ضد کرتا ہے تو شاعر کہتا ہے:

پھر پڑا روئے گا اے نو واردِ اقلیمِ غم — چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم

اور کس سادگی سے مشورہ دیتا ہے:

آہ کیوں دکھ دینے والی شے سے تجھ کو پیار ہے — کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

---

[1] کلیات اقبال ص ۴۰-۴۱۔

اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بیتابی ہے کیا　　اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا

اور پھر سوال کرتا ہے :

گیند ہے تیری کہاں چینی کی بلّی ہے کدھر　　وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

بچہ جب آئینہ لیتا ہے تو شاعر کو اس کے ٹوٹنے کا خوف پیدا ہوتا ہے :

ہے تجھے کچھ فرش پر اس کو گرانے میں مزا　　ٹوٹ جائے آئینہ میرا تجھے پروا ہے کیا

ذیل کے اشعار میں بچوں کی فطرت کی کس قدر اچھی ترجمانی ملتی ہے ۔

تالیوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی　　مل گئی جو شے تجھے تیرا کھلونا بن گئی

جب کسی شے پر بگڑ کر مجھ سے چلّاتا ہے تو　　کیا تماشا ہے ردّی کاغذ سے من جاتا ہے تو

اور آخری چار شعروں میں شاعر بچے کی بعض خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے آپ کو اس جیسا بتاتا ہے :

آہ اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا　　تو تلوّن آشنا، میں بھی تلوّن آشنا

عارضی لذّت کا شیدائی ہوں چلّاتا ہوں میں　　جلد آجاتا ہے غصّہ جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری　　کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صورت گاہ گریاں، گاہ خنداں میں بھی ہوں　　دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفلِ ناداں میں بھی ہوں

اس طرح یہ نظم بچوں کے مزاج کی ترجمانی کرتی ہوئی اپنی سادہ بیانی کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی ہے ۔

اقبال کی ایک اور نظم " بچہ اور شمع " مخزن لاہور ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی جو تین بند پر مشتمل ہے ۔ اشعار کی تعداد پندرہ ہے ۔ بانگ درا میں ایک شعر کی اصلاح کر دی گئی ہے ۔[1]

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
دیکھتی ہے آنکھ ہر قطرے میں یاں طوفانِ حسن

بانگ درا میں دوسرا مصرع اس طرح تبدیل کر دیا گیا ہے :

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن　　آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن

---

[1] کلیات اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق ص ۱۳۱ ۔

پہلا بند تین شعروں پر مشتمل ہے جس میں شاعر بچّے سے جو شمع کی روشنی کو گھور کر دیکھتا ہے یوں سوال کرتا ہے :

ع روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا
ع یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے

دوسرا بند چار شعروں پر مشتمل ہے جس میں علاّمہ اقبال " بچّہ اور شمع " پر نہایت فلسفیانہ انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ شمع تو صرف ایک شعلہ ہے لیکن تو مجسّم نور ہے، قدرت نے اسے ظاہر کر دیا ہے اور تجھے (بچّہ) پوشیدہ رکھا ہے۔ اور پھر آخری شعر میں زندگی کے راز کو اس طرح فاش کرتے ہیں :

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بے ہوشی ہے یہ

اور آخری بند میں بتاتے ہیں کہ دنیا کی محفل بے پایانِ حسن میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہر جگہ حسن ہی حسن ہے، کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں، سورج کی چمک میں، رات کی تاریکی میں، آسمان کی آئینہ پوشی میں، شام کی تاریکی اور شفق کی گل فروشی میں، عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں، طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں، ساکنانِ گلشن کی ہم آوازی میں، پہاڑوں کے چشمہ میں، دریا کی آزادی میں، شہروں میں، ویرانوں میں لیکن اس کے باوجود روح کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کی صورت ماہیِ بے آب کی ہے :

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

مندرجہ بالا تین نظموں کی روشنی میں یہ بات بہت صاف ہو جاتی ہے کہ علاّمہ اقبال کو بچپن کی زندگی سے کتنا تعلق رہا ہے، وہ بچپن کو کن کن زاویوں سے دیکھتے ہیں اور ان سے کیا کیا نتائج اخذ کرتے ہیں جن سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر بھی علاّمہ اقبال کے یہاں فلسفیانہ فکر و عمل کی کارفرمائی تھی۔ یہ تینوں نظمیں علاّمہ اقبال کی ابتدائی زندگی ہی کی تخلیق کردہ ہیں۔

بچّوں کے لیے " ایک مکڑا اور مکھی "، " ایک پہاڑ اور گلہری "، " ایک گائے اور بکری "، " ہمدردی "، " ماں کا خواب "، " ایک پرندہ اور جگنو "، " پرندے کی فریاد " سات نظمیں ہیں۔

جن میں پہلی چھے نظمیں ماخوذ ہیں، یہ نظمیں ہلکی، سادہ اور سلیس زبان میں ہیں، جن میں ایسی کہانیاں پیش کی گئی ہیں، جو بچّوں کے لیے بہت سبق آموز ہیں۔" ایک مکڑا اور مکھی" تیئیس اشعار پر مشتمل ہے بانگِ درا میں مندرجہ ذیل شعر زیادہ ہے ؎

انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں بُرا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا

یہ نظم MARY HOWITT کی THE SPIDER AND THE FLY سے ماخوذ ہے جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دشمن کی خوشامدانہ بات میں ہرگز نہیں آنا چاہیے، زبان نہایت رواں اور عام فہم ہے، "مکڑا اور مکھی" کی گفتگو کی مدد سے پوری کہانی تیار کی گئی ہے

دوسری نظم "ایک پہاڑ اور گلہری" امریکہ کے مشہور شاعر EMERSON R.W. کی مشہور نظم THE MOUNTAIN AND THE SQUIRREL سے ماخوذ ہے جس میں کل بارہ اشعار ہیں۔ پہاڑ نہایت تکبّر سے گلہری سے کہتا ہے کہ "نہایت کم درجہ چیز ہو کر اس قدر غرور میں مبتلا ہے۔ میری شان کے آگے تیری حقیقت کیا ہے" کہاں پہاڑ کہاں غریب گلہری۔ جواب میں گلہری نے کہا اگر تو بڑا ہے تو کیا، میں درخت پر چڑھنا جانتی ہوں، تو اس صلاحیت سے محروم ہے، تو بڑا ہے تو ذرا چھالیا کتر کر بتا اگر میں تیری طرح بڑی نہیں ہوں، تو تو بھی میری طرح چھوٹا نہیں۔ پہلے بند میں پہاڑ کی گفتگو ہوتی ہے۔ دوسرا بند گلہری کے جواب پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل شعر پر نصیحت کے ساتھ ختم ہوتا ہے اور اپنا ایک ہلکا سا تاثر چھوڑ جاتا ہے:

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہ کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزّاق ص ۹۱۔
لہ کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزّاق ص ۹۴۔

"ایک گائے اور بکری" انیسویں اشعار پر پھیلی ہوئی ہے جو TAYLER JANE کی مشہور نظم THE COW AND THE ASS سے ماخوذ ہے اس نظم کے بارے میں ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کا کہنا ہے:

"... نہ صرف ماخوذ ہے بلکہ اس کا کامیاب ترجمہ بھی ہے۔ جین ٹیلر کے ہاں نظم کا عنوان نظم کے مرکزی خیال کے مطابق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے گدھا، انسان کی کائنات میں مظلوم ترین مخلوق ہے اور اگر وہ اس کے باوجود انسان میں کوئی خیر کا پہلو دیکھ سکتا ہے، تو اس سے شاعر کے انسانی خیر کے عقیدے کا ثبوت ملتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اقبال نے نہ صرف نظم کے ماحول کو مقامی رنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے بلکہ مقامی روایات کا احترام کرتے ہوئے نظم کا عنوان بھی بدل دیا ہے"[۲]

نظم کی ابتدا ایک خوبصورت منظر سے اس طرح ہوتی ہے:

ایک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں — تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں — ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت — اور پیپل کے سایہ دار درخت
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں — طائروں کی صدائیں آتی تھیں

اسی مقام پر:

کسی ندی کے پاس اک بکری — چرتے چرتے کہیں سے آنکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا — پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جُھک کر اسے سلام کیا — پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی، مزاج کیسے ہیں — گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

پھر گائے اپنی بھلی بری زندگی اور پریشانی کو بیان کرتے ہوئے آدمی کی شکایت کرتی ہے:

---

۱ کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق ص ۹۴۔
۲ سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲۷۔

آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے　　اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے　　ہوں جو دُبلی تو بیچ کھاتا ہے

بکری بہت سمجھ دار اور سوجھ بوجھ والی تھی نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی ہے:

یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　یہ ہری گھاس اور یہ سایہ
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں　　یہ کہاں بے زباں عزیب کہاں
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں　　لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی　　قید ہم کو بھلی، کہ آزادی ؟

اس نظم کے ذریعے بچوں کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نیکی کرنے والوں کا احسان ضرور ماننا چاہیے۔ نظم کی زبان نہایت پاکیزہ، رواں، دواں اور سلیس ہے۔ اس میں گائے اور بکری دو کردار ہیں اور ان ہی کے سہارے کہانی آگے بڑھتی اور اختتام تک پہنچتی ہے۔ گفتگو کی ابتدا بکری یہ پوچھتے ہوئے کرتی ہے۔ کیوں بڑی بی، مزاج کیسے ہیں؟ اور انتہا گائے کے اس اقرار پر ہوتی ہے:

گائے سن کر یہ بات شرمائی　　آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے　　اور کچھ سوچ کر کہا اس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی　　دل کو لگتی ہے بات بکری کی

"ہمدردی"[1] یہ مختصر نظم انگلستان کے مقبول شاعر "ولیم کوپر" کی نظم سے ماخوذ ہے، جو کل آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس میں بلبل کی پریشانی دیکھ کر کہ وہ اندھیری رات میں کیسے آشیانے تک پہنچے گی جگنو اپنی خدمات پیش کرتا ہے:

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے　　کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری　　میں راہ میں روشنی کروں گا

اور آخری شعر میں وہ کام کی بات اس طرح کہہ جاتا ہے:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　آتے ہیں جو کام دوسرے کے

---

[1] کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق ص ۹۰۔

اس طرح اس مختصر نظم کے ذریعہ شاعر بچّوں کے دلوں میں دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب اس لیے ہے کہ جگنو کے ذریعہ جو بات کہی گئی ہے وہ دلوں میں اترتی نظر آتی ہے۔ یہاں بھی زبان بہت سادہ ہے۔

"ماں کا خواب" کلیاتِ اقبال میں "ماں اور بچّہ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں کل پندرہ اشعار ہیں۔ یہ نظم بھی ماخوذ ہے۔ جس میں ماں خواب میں دیکھتی ہے کہ لڑکوں کی ایک قطار ہے جس میں تمام بچّے زمرّد کی طرح پوشاک پہنے ہوئے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں دیے لیے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، بچوں کی اس قطار میں اس کا اپنا بچّہ بھی ہے لیکن وہ سب کے پیچھے ہے اور اس کے "ہاتھ" کا دیا جل نہیں رہا ہے۔ ماں اپنے بچّے کو دیکھ کر پہچان لیتی ہے اور اس سے شکایت کرتی ہے:

مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟

اور اپنی حالت بتاتی ہے:

جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار — پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار

ماں کا پیچ و تاب دیکھ کر بچّہ منہ پھیر لیتا ہے اور کہتا ہے:

رُلاتی ہے تجھ کو جدائی مری — نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا — دِیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے — ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

ہلکی پھلکی زبان میں یہ نظم بھی بچّوں کو آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے لیکن اس کا موضوع بچّوں کے لیے نہیں ہے بلکہ ان ماؤں کے لیے ہے جو اپنے بچّوں کے انتقال پر بہت روتی ہیں۔ اور آنسوؤں کا سیلاب بہاتی ہیں۔ اس نظم کے ذریعہ انھیں رونے سے روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"پرندے کی فریاد" کلیات اقبال میں "ایک[1] پرندے کی فریاد" کے عنوان سے

---

[1] کلیات اقبال مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق ص ۶۲

شائع ہوئی ہے۔ جس میں کل بیس اشعار ہیں۔ جو پانچ بند پر منقسم ہیں۔ بانگ درا میں اس سے گیارہ اشعار انتخاب کیے گئے ہیں جن میں بعض اشعار میں معمولی اصلاح کر دی گئی ہے لیکن ایک مصرع بہت زیادہ تبدیل ہو گیا ہے ملاحظہ ہو:

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد مجھ کو شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دُھلانا
(کلیات اقبال)

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد مجھ کو شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
(بانگ درا)

اور کلیات اقبال میں درج پہلے شعر کا پہلا مصرع اور دوسرے شعر کا دوسرا مصرع لے کر ایک نیا شعر بنایا گیا ہے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

حذف شدہ اشعار یا مصرعے یہ ہیں ؎

وہ جھاڑیا چمن کی وہ میرا آشیانہ (پہلے شعر کا دوسرا مصرع)
وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی (دوسرے شعر کا پہلا مصرع)
پتوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا
تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اس کی تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آشیانا
باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں
ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں ٹہنی پہ گل کے بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا اس اجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں
چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے ساتھی جو ہیں پرانے ان سے ملوں ملاؤں
پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی
آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گزارے اس کو بھلا خبر کیا، یہ قید کیا بلا ہے

یہ نظم اگرچہ قیدی پرندے کی زبان سے فریاد کی صورت میں ہے اور بظاہر بچوں کے لیے ہے لیکن اس کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غلام ہندستانیوں کو ان کی غلامانہ زندگی کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے، عجیب رنج و غم، سوز و گداز، بے بسی اور بے کسی کی کیفیت پائی جاتی ہے:

آزادیاں کہاں اب وہ اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا
اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں — ڈر ہے یہی قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں
آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے — میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

اس سلسلے کی آخری نظم "ایک پرندہ اور جگنو" ہے جس کے بارے میں کلیات اقبال میں درج ہے:

"یہ نظم انگلستان کے ایک نازک خیال شاعر ولیم کوپر کی ایک مشہور و مقبول نظم "اے نائٹ اینگل اینڈ گلوورم" سے ماخوذ ہے، بچوں کی اکثر درسی کتابوں میں درج کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں نقل کا پایہ اصل سے بھی بلند و بالا ہو گیا ہے۔"

اس نظم میں کل بارہ اشعار ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ سرِ شام ایک ٹہنی پر ایک مرغ بیٹھا گا رہا تھا کہ اس کی نظر جگنو پر پڑی، وہ اسے اپنی چونچ میں لینے کے لیے فوراً اڑا، تو جگنو نے نہایت سچی اور اچھی بات کہی جس میں حمد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے:

کہا جگنو نے اے مرغِ نوا ریز — نہ کر بے کس پہ منقارِ ہوس تیز
تجھے جس نے چہک گل کو مہک دی — اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی — تجھے اس نے صدائے دلربا دی
چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو ساز تجھ کو

اور سوز و ساز ایک دوسرے کے مخالف نہیں ہیں بلکہ ان کی ہم آہنگی سے دنیا قائم ہے:

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی — اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

یہ نظم زبان کے لحاظ سے آسان نہیں ہے مگر اچھی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر

لہ کلیات اقبال مرتبہ مولوی عبد الرزاق ص ۱۲۳۔

س کے بارے میں رقم طراز ہیں :

"اقبال نے اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ دنیا میں سوز اور ساز دونوں کے دم اور قدم سے رونق ہے جب تک انسان کو سکھ کے ساتھ دکھ نہ پہنچے وہ زندگی کا راز بخوبی سمجھ نہیں سکتا۔ خوشی اور غم کے پہلو بہ پہلو وارد ہونے ہی سے انسان ترقی کی منزلیں طے کر کے کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے"[1]

ان نظموں کے علاوہ بچوں کے لیے دو نظمیں اور ہیں ایک "بچے کی دعا" اور دوسری "ہندستانی بچوں کا قومی گیت" دونوں نظمیں بڑی اہم ہیں اور مشہور و مقبول رہی ہیں۔ ایک زمانے میں ہر اردو خاندان کے بچوں کی زبان پر یہ نظمیں ہوتی تھیں۔ مدرسوں میں بچے اسے پڑھائی سے پہلے یا بعد میں گایا کرتے تھے اور دلوں میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیا کرتے تھے۔

"بچے کی دعا" دو بند یا چھے شعروں پر مشتمل، یہ نظم بچے کے دل میں خدائے بزرگ تر کی عظمت کا احساس پیدا کرتی ہے اور اسی سے سب کچھ مانگنے کے لیے پاکیزہ جذبات پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ بچہ اپنے خدا سے شمع کی طرح زندگی چاہتا ہے تاکہ دنیا کی تاریکی کو دور کر سکے اور اپنے دم سے ہر جگہ اُجالا کر سکے۔ اس طرح اس کی زندگی سے اس کے وطن کی زینت میں اضافہ ہو جائے، دوسرے بند میں وہ اپنی زندگی کو پروانے کی صورت میں چاہتا ہے تاکہ علم کی شمع سے پروانہ وار الفت کر سکے اور وطن کے غریبوں کی حمایت اور دردمندوں سے محبت کر سکے گویا بارگاہ خداوندی میں بچہ یہ دعا کرتا ہے کہ اس کی زندگی شمع اور پروانے کی صورت ہو جائے تاکہ وہ دنیا کی، وطن کی دردمندوں اور غریبوں کی خدمت کر سکے، اقبال کی یہ پہلی نظم ہے جس کے ذریعہ بچوں کے دلوں میں اس طرح انسانیت کی خدمت کی اچھی آرزوئیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخری شعر نہایت خوب ہے میرے خیال میں بچوں کے دلوں میں پہلی آرزو

---

[1] مطالب بانگ درا از غلام رسول مہر ص ۹۲۔

یہی پیدا ہونی چاہیے :

میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

دوسری نظم "ہندستانی بچّوں کا قومی گیت" فروری ۱۹۰۵ء میں مخزن لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ کلیاتِ اقبال میں یہ نظم "میرا وطن" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں پانچ بند ہیں۔ بانگ درا میں آخری بند حذف کر دیا گیا ہے۔ بعض مصرعوں میں معمولی اصلاح بھی کر دی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نانک نے جس چمن میں وحدت کا راگ گایا

(کلیات اقبال)

بانگِ درا میں "راگ" کی جگہ "گیت" استعمال کیا گیا ہے۔

ع نوح نبی کا ٹھہرا اگر جہاں سفینا (کلیات اقبال)

بانگ درا میں معمولی تبدیلی کر دی گئی ہے ع "نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا" حذف شدہ بند ذیل میں ہے :

گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے — عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے — ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے ارم ہے

میرا وطن یہی ہے میرا وطن یہی ہے

بچوں کے لیے اقبال کی یہ پہلی نظم ہے جس میں وطن سے محبّت کا جذبہ بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اس کی عظمت سے آگاہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ سارے مذاہب کے ماننے والے ہندستانیوں میں محبت اور یگانگت کا سبق پڑھایا گیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کا احترام کر سکیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اچھے ہندستانیوں کی زندگی گزار سکیں، اسی لیے اس نظم میں حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰ مسیحؑ، حضرت محمدؐ (میرعرب) خواجہ معین الدینؒ چشتی اور

لے کلیات اقبال مرتبہ مولوی عبدالرزاق ص ۶۶۔

گرو نانک مختلف مذاہب کے پیغمبروں اور بزرگوں کا ذکر ملتا ہے اور مختلف قوموں، تاتاریوں، حجازیوں، یونانیوں، ترکوں کا تذکرہ بھی ہے اور شہروں اور ملکوں میں فارس سینا، جاپان، یروشلم وغیرہ کے نام بھی آگئے ہیں۔

نظم کی زبان سادہ، سلیس، شیریں اور دلکش ہے اس لیے یہ نظم بچوّں اور بڑوں میں بھی بہت پسند کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہے۔

مندرجہ بالا نظموں کے مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال نے اگرچہ بچوّں کے لیے بہت زیادہ نظمیں نہیں کہی ہیں لیکن جتنی بھی ہیں ان کے ذریعہ دلچسپ انداز میں زندگی کو سمجھنے اور بہتر طریقہ سے اسے برتنے کا سبق دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ وطن پرستی اور انسان دوستی کا احساس بھی جگایا گیا ہے۔

ان نظموں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاّمہ اقبال کو بچپن کی زندگی بہت عزیز تھی، اسی لیے وہ بچپن کے زمانے کو کبھی کبھی یاد کرتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی والدہ جب داغِ مفارقت دے گئیں تو انھوں نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" ایک نہایت پُر درد، پُر تاثیر نظم کہی جس میں اپنے بچپن کو یاد کر کے خود بھی مضطرب ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی بے چین کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بہ پا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشم گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اترآتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال کو بچپن اور بچوّں سے گہری دلچسپی تھی اسی لیے انھوں نے بچوّں کے لیے شاعری کی۔ ان کی شاعری کا یہ حصّہ اگرچہ محدود ہے اور ان نظموں میں کسی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے وہ محض نصیحت دینے

کے لیے کہی گئی ہیں۔ ان سے ہٹ کر کھیل کود اور ہنسنے ہنسانے کی باتوں کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کی بڑی اہمیت ہے اس لیے کہ ان نظموں کے مطالعے سے ہمیں اقبال کے انسانِ کامل کی تلاش میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ بچّے کے ذہن کی تعمیر اس طرح کرنا چاہتے تھے جس سے وہ ایک ایسا انسان بن سکے جو خدا آگاہ ہو، صداقت شعار ہو، حرّیت پسند ہو، ہمدرد مجسّم ہو، غرور و تکبّر سے پاک ہو، محسن شناس ہو، خدمت گزار ہو، غریبوں کا مددگار ہو، کمزوروں کا حامی ہو، وطن پرست ہو، انسان دوست ہو، برائیوں سے پاک ہو، اور پیکرِ عمل ہو، ظاہر ہے کہ ان صفات کا حامل بچّہ جوان ہو کر ویسا ہی انسان بنے گا جس کے اقبال خواہش مند تھے۔ اس لیے اردو میں بچّوں کے ادب میں اقبال کی شاعری کے اس حصّے کو ہمیشہ اہم مقام دیا جاتا رہے گا۔

اقبال اور بمبئی

علاّمہ اقبال نے لاہور سے غالباً پہلی بار قدم اس وقت باہر نکالا جب وہ اعلا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان تشریف لے جا رہے تھے۔ چنانچہ پہلی بار یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو وہ لاہور سے روانہ ہوئے اور ۲ ستمبر کی صبح کو وہ دہلی پہنچے اور ایک دن وہاں قیام کے بعد ۳ ستمبر کو بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔ ۷ ستمبر کو انگلستان کے لیے جہاز پر سوار ہوئے اور یورپ میں تقریباً تین سال قیام کر کے اور اعلا تعلیم سے فراغت پا کر بمبئی اور دہلی ہوتے ہوئے لاہور واپس آ گئے۔ اس کے بعد اپنی زندگی کے مختلف حصوں میں مختلف ضرورتوں سے ہندستان کے مختلف شہروں علی گڑھ، شملہ، کشمیر، پٹنہ، مدراس، بنگلور، میسور، سرنگاپٹم، حیدرآباد، الہ آباد، بھوپال اور پانی پت وغیرہ آئے گئے۔ لیکن اقبال کے کسی سوانح نگار نے تفصیل یا اختصار کے ساتھ ان تمام شہروں کا ایک ساتھ تذکرہ نہیں کیا ہے بلکہ اگر ذکر آیا ہے تو کچھ شہروں کا وہ بھی اس قدر سرسری کہ علاّمہ کے سفر کی غرض و غایت اور ان شہروں میں علاّمہ کے قیام کے دوران کے حالات و واقعات سے کوئی خاص واقفیت نہیں ہوتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ جن شہروں میں علاّمہ اقبال کی آمد و رفت رہی ہے یا مختصر یا زیادہ مدّت تک قیام رہا ہے اقبال کے تعلق سے اُن شہروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلی کام کیا جائے، تاکہ اقبال کی زندگی کا کوئی حصّہ اوجھل نہ رہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اِدھر چند برسوں میں بھوپال[1]

---

[1] 'علاّمہ اقبال بھوپال میں' از عبدالقوی دسنوی ۱۹۷۶ء۔ اقبال اور بھوپال از صہبا لکھنوی ۱۹۷۳ء

حیدرآباد[1]، کشمیر[2]، اور دلی[3] سے متعلق تفصیلی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ بعض دوسرے شہروں سے متعلق بھی چھوٹے چھوٹے مضامین مختلف رسائل کے ذریعہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس طرح اقبال سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس قسم کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ میرا یہ مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں علامہ اقبال کی بمبئی میں آمد و رفت اور قیام کے سلسلے میں ان سے متعلق حالات، واقعات اور تاثرات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

علامہ کا یہ پہلا طویل سفر تھا جس میں دہلی کے بعد بمبئی جیسے عظیم شہر میں انھیں چار دن رہنے کا موقع ملا۔ بمبئی وہ ۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو پہنچے تھے اور ایک انگلش ہوٹل میں قیام کیا تھا، اس سفر کی تفصیل کہیں نہیں ملتی البتہ خود علامہ اقبال نے اس سفر کے تاثرات، ہوٹل کے قیام، لوگوں سے ملاقات اور دوسرے تجربات کو نہایت تفصیل سے اپنے طویل خط بنام مولوی انشاء اللہ خاں میں لکھا ہے، اس خط کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

" ۳ ستمبر (۱۹۰۵ء) صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۴ ستمبر کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی منزل میں پہنچا ـــــ ریلوے اسٹیشن پر تمام ہوٹلوں کے ٹکٹ ملتے ہیں مگر میں نے ٹامس کک کی ہدایت سے انگلش ہوٹل میں قیام کیا اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ ہوٹل ہندستانی طلبہ کے لیے جو ولایت جا رہے ہوں، نہایت موزوں ہے۔ ریلوے اسٹیشن یہاں سے قریب ہے، گھاٹ یہاں سے قریب ہیں ٹامس کک کا دفتر یہاں سے قریب، غرض ہر قسم کا آرام ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہر کے باقی تمام ہوٹلوں کی نسبت ارزاں ہے، صرف تین روپے

---

[1] اقبال اور حیدرآباد از نظیر حیدرآبادی ۱۹۶۱ء۔
[2] اقبال اور کشمیر از پروفیسر جگن ناتھ آزاد ۱۹۷۷ء۔
[3] اقبال اور دلی از عبدالقوی دسنوی ۱۹۷۸ء۔

یومیہ دو اور ہر قسم کا آرام حاصل کرلو، یہاں کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آجاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علما باوجود عبادت اور مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا پیدا نہیں ہوتا، کارلائل نے کیا خوب کہا ہے:

محنت ہی بہت بڑی عبادت ہے

میرے دل پر اُس پیر مرد کی صورت کچھ ایسا اثر کرتی تھی کہ بعض اوقات اسے دیکھ کر میری آنکھیں پُرنم ہوجاتی تھیں، لیکن جب اس کی وقعت میرے دل میں اندازہ سے زیادہ ہوگئی تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا بیان بعض وجوہ سے ضروری ہے۔ میں ایک شام نیچے کی منزل میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ پارسی پیر مرد کمرے سے باہر نکلا، اس کی بغل میں شراب کی ایک بوتل تھی، جب اس نے مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس کو چھپانے کی کوشش کی اور میں نے دور سے تاڑ کر آواز دی کہ سیٹھ صاحب ہم سے کیوں چھپاتے ہو، خوشی سے اس کا شوق کرو، ذرا مسکرایا اور کچھ پیے بھی تھا بولا:

شراب شوک پینے سے سبھی گم دور ہوجائے

میں نے سُن کر کہا، وارے بڈھے، خدا تیری عمر دراز کرے اور تیری پرانی شاخ سے بہت سا میوۂ نورس پیدا ہوکر بمبئی کھیت باڑی میں بکتا پھرے[1]"

اسی ہوٹل کا ایک اور واقعہ علامہ اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا، جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بولتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا، تم کہاں سے آئے ہو؟ بولا،

---

[1] خطوط اقبال مرتب رفیع الدین ہاشمی ص ۷۹۔

چین سے آیا ہوں، اب ٹرانسوال جاؤں گا۔ میں نے پوچھا چین میں تم کیا کام کرتے تھے؟ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا، لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے سن کر دل میں کہا ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو، شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ، ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو، کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سر نو قائم کرنے میں تمھاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروّت کی بو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکّا مسلمان سمجھتے جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکّا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمانوں کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی دماغوں کے خیالات ہماری خوراک ہیں، کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں! مولوی صاحب میں بے اختیار ہوں، لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات مجھے مجنوں سا کر دیا اور کر رہا ہے[1]۔"

آگے دو ترک نوجوانوں کے متعلق نہایت دلچسپ انداز میں بتاتے ہیں۔

"ایک شب میں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے، شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اُٹھے تو ایک نے کرسی کے نیچے سے اپنی ترکی ٹوپی نکال کر پہنی، جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی ترک ہے، میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح اُن سے ملاقات ہو، دوسرے روز میں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں، یورپ

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۰۔

کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ میں نے پوچھا فارسی جانتے ہو، بولا، بہت کم پھر میں نے فارسی میں اس سے گفتگو شروع کی لیکن وہ نہ سمجھتا تھا، آخر بہ مجبوری ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کیں۔

یہ نوجوان ترک ینگ ٹرک پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے، باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ۔ کہنے لگا کمال بے (ترکی کا سب سے بڑا مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں اور اکثر پولیٹیکل معاملات پر لکھا کرتا ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے سنائے سب کے سب نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعر اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ ان میں سے ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں:

ظلم وجورن لو سفوجہ بر ملتے محوایلیور
آدمیت ملک وملت دشمن عبدالحمید

"یعنی کہیں ظلم و جور نے قوم کو مٹا دیا ہے عبدالحمید آدمیت اور ملک و قوم سب کا دشمن ہے" اس مضمون پر اس سے بہت گفتگو ہوئی اور میں نے اسے بتایا کہ ینگ پارٹی کو، انگلستان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ جس طریق سے رعایا انگلستان نے بتدریج اپنے بادشاہوں سے پولیٹیکل حقوق حاصل کیے ہیں۔ وہ طریق سب سے عمدہ ہے بڑے بڑے عظیم الشان انقلابوں کا بغیر کشت و خون کے ہو جانا یہ کچھ خاک انگلستان کا ہی حصہ ہے [1]"

علامہ اقبال نے اپنے اس طویل خط میں اسلامیہ مدرسہ (بمبئی) کے ایک طالب علم سے گفتگو کو بھی نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے جس سے علامہ اور بمبئی کے اس اسکول کے طالب علم کے سوچنے اور غور و فکر کرنے کے انداز کا پتا چلتا ہے لکھتے ہیں:

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۱۔

"..... ایک روز شام میں اور یہ ترک جنٹلمین بمبئی کا اسلامیہ مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ وہاں اسکول گراونڈ میں مسلمان طلبہ کرکٹ کھیل رہے تھے ہم نے ان میں سے ایک کو بلایا اور اسکول کے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں۔ میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ انجمن اس اسکول کو کالج کیوں نہیں بنا دیتی کیا فنڈ نہیں ہے یا اور کوئی وجہ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ فنڈ تو موجود ہے اور اگر ضرورت ہو تو ایک آن میں موجود ہو سکتا ہے کیونکہ خدا کے فضل سے یہاں بڑے بڑے متمول مسلمان سوداگر موجود ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان طلبہ پڑھنے کے لیے نہیں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور اچھے اچھے کالج بمبئی میں موجود ہیں اور جیسی تعلیم اُن میں ہوتی ہے ویسی سردست ہم یہاں دے بھی نہیں سکتے ہیں، یہ جواب سن کر میں بہت خوش ہوا، میرا خیال تھا کہ بمبئی جیسے شہروں میں مسلمانوں کا کالج ضرور ہوگا کیونکہ یہاں کے مسلمان تمول میں کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں لیکن یہاں آکر معلوم ہوا کہ تمول کے ساتھ ان میں عقل بھی ہے۔ ہم پنجابیوں کی طرح احمق نہیں ہیں۔ ہر چیز کو تجارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نفع و نقصان پر ہر پہلو سے غور کر لیتے ہیں[1]۔"

اس کے بعد علامہ اقبال شہر بمبئی کے متعلق نہایت چبھتے الفاظ میں اپنے تجربات و تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"غرض کہ بمبئی (خدا اسے آباد رکھے) عجب شہر ہے، بازار کشادہ، ہر طرف پختہ سر بہ فلک عمارتیں ہیں کہ دیکھنے والے کی نگاہ اُن سے خیرہ ہوتی ہے۔ بازاروں میں گاڑیوں کی آمد و رفت اس قدر ہے کہ پیدل چلنا محال ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر چیز مل سکتی ہے، یورپ امریکہ کے کارخانوں کی کوئی چیز طلب کرو، فوراً ملے گی البتہ ایک چیز ایسی ہے جو اس شہر میں

---

[1] خطوط علامہ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۳

نہیں مل سکتی یعنی فراغت ؎۱"

ایک اور جگہ بمبئی کے بارے میں لکھتے ہیں :

" اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے، ہمارے ہوٹل کا حجام ہندستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا، گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا۔ اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے بولا" حضور کالوں کے لیے لڑتا ہے۔" ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں، میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھا تم اردو پڑھ سکتے ہو کہنے لگے نہیں، سمجھ سکتے ہیں، پڑھنا نہیں جانتے۔ میں نے پوچھا جب مولوی تمھارے نکاح پڑھاتا ہے تو کون سی زبان بولتا ہے مسکرا کر بولا" اردو"! یہاں پر ہر کوئی اردو سمجھا سکتا ہے۔ اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتا ہے۔ ہمارے ہوٹل کا سیٹھ (وہی بوتل والا پیر مرد) کبھی ہندستان نہیں گیا مگر اُردو خاصی بولتا ہے ؎۲"

اسی خط میں پارسی قوم کے متعلق نہایت سچی اور سلجھی ہوئی رائے کا اظہار کیا ہے۔

"یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی، نوّے ہزار کے قریب ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابل تعریف ہے اور ان کی دولت و عظمت بے اندازہ۔ مگر اس قوم کے لیے کسی اچھی فیوچر (FUTURE) کی پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔

؎۱ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۴۔

؎۲ خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۵۔

علاوہ اس کے نہ کوئی ان کی زبان ہے نہ ان کا لٹریچر ہے اور طرّہ یہ کہ فارسی کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! یہ لوگ فارسی لٹریچر سے غافل ہیں ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ ایرانی لٹریچر میں عربیت کو فی الحقیقت کوئی دخل نہیں ہے بلکہ زردشتی رنگ اس کے رگ وریشہ میں ہے اور اسی پر اس کے حسن کا دارو مدار ہے، میں نے اسکول کے پارسی لڑکوں اور لڑکیوں کو بازار میں پھرتے دیکھا چستی کی مورتیں تھیں مگر تعجب ہے ان کی خوبصورت آنکھیں اسّی فی صدی کے حساب سے عینک پوش تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عینک پوشی پارسیوں کا قومی فیشن ہوتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کے قومی ریفارمر اس طرف توجہ کیوں نہیں کرتے[1]"

اور بمبئی سے روانگی کا حال بھی نہایت دلچسپ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

"میں بمبئی یعنی باب لندن کی کیفیت دیکھ کر حیراں ہوں، خدا جانے لندن کیا ہوگا۔ جس کا دروازہ ایسا عظیم الشان ہے اچھا دیدہ خواہد شد۔ ۷ ستمبر کو دو بجے ہم وکٹوریہ ڈاک (گھاٹ) پر پہنچے جہاں مختلف کمپنیوں کے جہاز کھڑے ہیں۔ اللہ اکبر یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ کئی طرح کے جہاز اور سیکڑوں کشتیاں ڈاک میں کھڑی ہیں اور مسافر سے کہہ رہی ہیں کہ سمندر کی وسعت سے نہ ڈرو خدا نے چاہا تو ہم تجھے صحیح وسلامت منزل مقصود پر پہنچا دیں گے۔ خیر طبّی معائنہ کے بعد میں اپنے جہاز پر سوار ہوا، لالہ دھنپت رام وکیل لاہور اور ان کے ایک دوست ڈاکٹر صاحب اس روز حسن اتفاق سے بمبئی میں تھے، ان کا نہایت سپاس گزار ہوں کہ یہ دونوں صاحب مجھے رخصت کرنے کے لیے ڈاک پر تشریف لائے بہت سے اور لوگ بھی جہاز پر سوار ہوئے اور ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کا ایک ہجوم ڈاک پر تھا کوئی تین بجے جہاز

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۴۔

نے حرکت کی اور ہم اپنے دوستوں کو سلام کہتے اور رومال ہلاتے ہوئے سمندر پر چلے گئے۔[1]"

اسی طرح علامہ اقبال نے خود ہی بمبئی اور اس کے حالات، تجربات اور تاثرات کو قلمبند کر کے ایک بڑی کمی پوری کر دی ہے لیکن جب تقریباً تین سال بعد ۱۹۰۸ء کے وسط میں ولایت سے واپسی ہوئی تو بمبئی میں ان کا قیام رہا یا نہیں اس بارے میں کہیں کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری، ممکن ہے کہ خطوط یا اخباروں میں کہیں کچھ یا بہت کچھ درج ہو اور کسی تحقیق کرنے والے کی منتظر ہو۔

حکومت برطانیہ نے ہندستان کے سیاسی مسائل کو سلجھانے کے لیے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس بلائی تھی جس میں شرکت کے لیے وائسرائے ہند کی طرف سے جن مندوبین کے نام دعوت نامے جاری ہوئے تھے اُن میں علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، سر آغا خاں وغیرہ بھی تھے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۱ء تک لندن پہنچنا لازمی قرار دیا گیا تھا۔

علامہ اقبال کو اس کانفرنس میں شرکت کے علاوہ ممالک اسلامی کی سیر کی خواہش بھی بہت زیادہ تھی نذیر نیازی صاحب کو ۱۹ اگست کو لکھتے ہیں:

"میں غالباً یکم ستمبر کی شام کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور ۵ ستمبر کو بمبئی۔ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی بڑی آرزو ہے۔ مگر یہ سب کچھ روپے پر منحصر ہے۔[2]"

لیکن علامہ اقبال ۵ ستمبر کو کسی وجہ سے بمبئی کے لیے روانہ نہ ہو سکے بلکہ ۸ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دہلی ہوتے ہوئے ۱۰ ستمبر کو بمبئی پہنچے جہاں خلافت ہاؤس

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۸۶۔

[2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۷۳۔

میں قیام رہا۔ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کا ملازم علی بخش بھی تھا، علاّمہ ایک خط بنام منشی طاہرالدین میں لکھتے ہیں:

"بمبئی پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوقی قنصل افغانستان مقیم بمبئی نے دعوت دی، ان کے ہاں پُرلطف صحبت رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر ہیں۔ فارسی میں خاقانی کے بڑے معترف ہیں۔ علوم دینی میں بھی کافی دسترس رکھتے ہیں، ہرات کے قاضی رہ چکے ہیں ان کے دولت کدہ پر مرزا طلعت یزدی نے جو بمبئی میں دس سال سے مقیم ہیں ایرانی لہجے میں اپنے اشعار سنائے۔ جو آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے۔ اسی شام عطیہ بیگم صاحبہ کے ہاں سماع کی صحبت رہی جہاں اہل ہوس بار نہیں پا سکتے:

بر سماع راست ہر کس چیز نیست!
طعمۂ بر مزعکے انجیر نیست![1]

یہاں شام سے مراد سہ پہر کی اس دعوت سے ہے جو ۱۰ ستمبر کو علامہ اقبال کے اعزاز میں محترمہ عطیہ فیضی اور مسٹر رحیمن فیضی نے ایوان رفعت میں دی تھی۔ اس دعوت میں شہر کے معززین اور اہل علم حضرات شریک ہوئے تھے۔ جن میں مرزا علی اکبر خاں، ڈاکٹر محی الدین صوفی، مولانا محمد عرفان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ضیاءالدین احمد برنی بھی اس دعوت میں موجود تھے وہ لکھتے ہیں:

"یہ ٹی پارٹی لان میں دی گئی تھی جس میں پھولوں کی پُربہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دلآویزی پیدا ہوگئی تھی، میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا تاکہ بیگم عطیہ کا ہاتھ بٹاؤں۔ اتفاق یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے پہنچنے میں دیر ہوگئی، بیگم صاحبہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ:

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۰۴

"موٹرلے کے جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ"
ابھی چند ہی فرلانگ گیا ہوں گا کہ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آرہے ہیں، ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ:
آپ کا وہاں بڑی شدّت کے ساتھ انتظار کیا جارہا ہے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:
میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاہتا ہوں۔
میں نے کہا:
یہ کام تو آپ پھر بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ہیں، انھیں آپ کس مد میں ستا رہے ہیں؟
بہر حال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضا مند ہو گئے تھوڑی دیر میں ہم "ایوان رفعت" پہنچ گئے۔
دروازے پر عطیہ فیضی اور رحمین فیضی نے استقبال کیا اور محترمہ عطیہ فیضی شکوہ شکایت کرتے ہوئے اقبال کو اس جگہ لے آئیں جہاں ٹی پارٹی ہونے والی تھی۔
خیلا احمد برنی صاحب لکھتے ہیں کہ انھوں نے علامہ اقبال کو اس قدر مسرور اور خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جس قدر وہ اس ٹی پارٹی میں نظر آرہے تھے۔ عطیہ فیضی سے مختلف موضوعات پر نہایت شگفتگی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے کبھی کبھی چست جملے بھی کستے جاتے تھے ایک بار عطیہ بیگم نے کہا:
"اقبال یاد رکھو بچّے کے لیے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ہے"۔
تو ڈاکٹر اقبال نے ہنس کر پوچھا:
"اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے"۔
چائے پینے کا سلسلہ ختم ہوا تو عطیہ فیضی نے اپنے معزز مہمان ڈاکٹر اقبال کا تعارف کرایا اور ان سے گزارش کی کہ وہ کچھ پیغام دیں، جس کے جواب میں علاّمہ اقبال نے ایک مختصر تقریر کی اور فارسی کا ایک شعر سناتے ہوئے کہا کہ میرا یہی پیغام ہے:

چناں ہمزن کہ اگر مرگ ماست مرگِ دوام
چناں زکردۂ خود شرمسار می گردد

فارسی داں حضرات تو اس شعر سے بہت لطف اندوز ہوئے لیکن وہ حضرات جو فارسی سے نابلد تھے ان کا اصرار ہوا کہ علامہ اس شعر کا مطلب انگریزی میں لکھا دیں چنانچہ علامہ نے اسی وقت ترجمہ لکھ دیا۔

LIVE SO BEAUTIFULLY THAT DEATH IS THE END OF ALL
GOD HIMSELF MAYBE PUT SHAME FOR HAVING THY CAREER.

پھر لان سے حاضرین کو ہال میں لے جایا گیا، جہاں تھوڑی دیر موسیقی پھر رقص کی محفل جمی، جس میں ایک کالی کلوٹی عیسائی عورت نے کمالات دکھائے۔ اس دوران میں علامہ نے کاغذ کا ایک ٹکڑا منگایا جس پر ذیل کے تین فارسی شعر لکھ کر عطیہ بیگم کو پیش کیا:

ترسم کہ تو می رانی زورق سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر، میری بہ حجاب اندر
برکشت و خیاباں پیچ برکوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت و لاآویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور حنا حورے نالد بہ رباب اندر

اور پھر کچھ دیر کے بعد ذیل کا مشہور شعر علامہ نے لکھ کر عطیہ فیضی کی طرف بڑھا دیا:

پرائویٹ:

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ کہیے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

محمد اقبال
بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

اس کے بعد علامہ نے حاضرین سے ہاتھ ملایا ایوان رفعت سے رخصت ہوئے[1]

---

[1] ایوان رفعت کی یہ تمام روداد عظمت رفتہ از ضیا احمد بدایونی ص ۲۷۳ اختصار کے ساتھ لی گئی ہے۔ دسنوی۔

بمبئی سے روانگی سے پہلے بمبئی کرانیکل کے نمایندوں نے اقبال سے انٹرویو لیا اور مختلف موضوعات سے متعلق سوالات کیے۔

ابتدا میں اقبال نے فرمایا:

"میں کسی بھی قوم کے فرقہ سے متعلق تعصب نہیں رکھتا میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ اسلام کو اپنی ابتدائی سادگی کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ میں ہندستانیوں کو پُرامن دیکھنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہر فرقے کو اپنی تہذیب اور انفرادیت برقرار رکھنے کی اجازت ہو۔"

نمایندہ کرانیکل نے سوال کیا:

"کیا آپ برطانوی شہنشاہیت کو مذہبی تصور کرتے ہیں؟

علامہ اقبال نے جواب دیا:

"تمام ریاستیں جو استحصال کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں غیر مذہبی ہیں۔"

نمایندہ کرانیکل:

"کیا آپ شاہی اداروں کے برقرار رکھنے سے متفق ہیں؟

علامہ اقبال:

"میں اِن اداروں کے حق میں نہیں اور نہ ہی دل سے جمہوریت کا حامی ہوں، میں جمہوریت کو اس لیے قبول کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔"

نمایندہ کرانیکل:

"آپ قومیت کے مخالف کیوں ہیں؟"

علامہ اقبال:

"میں اسے اسلام کی اعلا اقدار سے متصادم پاتا ہوں، اسلام محض اعتقادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک معاشرتی ضابطہ ہے، اس نے رنگ کا مسئلہ حل کر دیا ہے، یہ انسانی ذہن کو ایک خاص رخ پر موڑ دینا چاہتا ہے، یہ درحقیقت بنی نوع انسان کی روحانی مساوات اور یکجہتی کا علمبردار

ہے، قومیت جیسا کہ اس پر عمل کیا جاتا ہے اِن اقدار کی مخالف ہے اسی لیے اس کا مخالف ہوں۔"

نمایندہ کرانیکل :

"کیا آپ گول میز کانفرنس کے بعد واپسی میں کسی اسلامی ملک کا دورہ کریں گے؟"

علامہ اقبال :

" میری خواہش یہ ہے کہ تمام یا جہاں تک ممکن ہو اتنے اسلامی ملکوں کا دورہ کروں، لیکن فنڈ کی کمی کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ بہت سے اسلامی ممالک کا دورہ کروں .... تمام اسلامی ممالک کا دورہ اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا جاسکے میرا ارادہ THE MODERN WORLD OF ISLAM کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کا ہے لیکن یہ بھی اس رقم پر منحصر ہے جو مجھے اس سفر کے دوران ملے گی، اس موقع پر قطعیت سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔"[1]

۱۲ ستمبر ۱۹۳۱ء کو علامہ اقبال تقریباً ایک بجے "ملوجا" نامی جہاز سے انگلستان کے لیے روانہ ہوگئے۔

دوسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہوکر علامہ اقبال ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو پلنا جہاز سے بمبئی پہنچے۔ کسٹم کے بعد غلام رسول مہر اور شفیع داؤدی کے ساتھ صبح دس بجے دارالخلافت پہنچے، جہاز پر لینے کے لیے مولانا محمد عرفان اور دوسرے احباب تشریف لائے تھے۔

اس مرتبہ بھی محترمہ عطیہ فیضی اقبال کے اعزاز میں "ایوان رفعت" میں دعوت دینا چاہتی تھیں لیکن علامہ اقبال و غلام رسول مہر بلا تاخیر لاہور پہنچنا چاہتے تھے۔ کچھ دیر علامہ نے دارالخلافت میں آرام کیا۔ شام کے وقت کسی دوست کے ساتھ "ایوان رفعت" پہنچے۔

---

[1] یہ انٹرویو اختصار کے ساتھ "سفرنامہ اقبال : محمد حمزہ فاروقی" (ص ۱۹-۲۰) سے لیا گیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی

قریب چھے بجے غلام رسول مہر بھی معذرت کے لیے ایوان رفعت پہنچے۔

علامہ اقبال نے آدھ گھنٹہ "ایوان رفعت" میں قیام کیا تھا۔ پھر اسٹیشن روانہ ہوئے۔ گاڑی کی روانگی کا وقت ۷ بج کر ۲۰ منٹ تھا۔ احباب خلافت اور دوسرے حضرات اسٹیشن پر موجود تھے، "شاہجہاں ہوٹل" کے مالک سیّد فضل شاہ بھی اسٹیشن پر موجود تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ علامہ اقبال کا قیام ان کے ہوٹل میں ہو، لیکن علامہ ایسا نہ کر سکے۔ چنانچہ سیّد فضل شاہ وہاں علامہ سے شکایت کر رہے تھے کہ انھوں نے نہ اُن کے ہوٹل میں قیام کیا اور نہ ہی دعوت قبول کی۔ گاڑی ٹھیک وقت پر بمبئی سے روانہ ہوئی۔

علامہ کے بمبئی میں اس طرح تین بار قیام کا پتا چلتا ہے ممکن ہے ان کا یہاں آنا اور بھی ہوا ہو لیکن مجھے ان کے علاوہ علامہ کے بمبئی کے کسی سفر کا علم نہیں ہو سکا ہے۔

(بنیادور : جنوری ۱۹۷۸ء)

اقبال اور علی گڑھ

اقبال کا تعلق علی گڑھ سے خاص طور سے مسلم یونی ورسٹی کی وجہ سے قائم ہوا تھا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی کے بانی سرسیّد کے نہ صرف دل سے قدر داں تھے بلکہ ان کے لیے ایک خاص عقیدت کا جذبہ ابتدائی عمر سے ہی رکھتے تھے۔ اس تعلق کی ابتدا غالباً اس وقت ہوئی جب مولانا میر حسن نے کہا:

"سرسیّد فوت ہو گئے ہیں ذرا تاریخ وفات کی فکر کرنا"

اقبال ایک شناسا کی دکان پر بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد سیّد ذکی شاہ سے کہنے لگے:

"تاریخ وفات ہو گئی ہے جاؤ ابھی شاہ صاحب کو سُنا دو"

"تاریخ تھی: انی متوفیک و رافعک الی و مطهرک"

اس واقعہ کے چند سال بعد اقبال نے ایک نظم "سیّد کی لوحِ تربت پر" لکھی جو جنوری ۱۹۰۳ء کے مخزن میں حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی:

"تخیّل کے کانوں نے سرسیّد مرحوم کی قبر سے وہ صدائے پُر درد سُنی، جس کی ایسے دل سے جو مرحوم کے پہلو میں تھا توقع ہو سکتی تھی۔ خوبی یہ ہے کہ سرسیّد زندگی میں کئی حیثیتوں کا جامع تھا اسی طرح اس کی لوحِ تربت

لے ذکر اقبال از عبد المجید سالک ص ۱۹۔

سے وہ کلمات نصیحت شیخ محمد اقبال کی طبع رسا نے اخذ کیے ہیں جو زندگی کے مختلف مشاغل کے جامع ہیں اور جن سے ہر طبقہ کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں' اس زمانے میں جب دہلی میں محمڈن کانفرنس کے جلسے زور و شور سے ہو رہے ہیں ان کا شائع ہونا ایک لطف مزید رکھتا ہے[1]"

ابتدا میں یہ نظم ۳۲ شعروں پر مشتمل تھی بانگِ درا میں اس سے صرف گیارہ شعر انتخاب کیے گئے ہیں۔ ایک شعر اصلاح شدہ ہے اور دو شعروں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بیس شعر حذف کر دیے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

اے کہ زائر بن کے میری قبر پر آیا ہے تو
یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے
دیکھ اپنوں میں کہیں بیدانہ ہوبے گانگی
دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں
راہبر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہیے
ہو شرابِ حبِّ قومی میں اگر سرشار تو
قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریں
کیا مزہ رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی
دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
وہ شجر ہے عشقِ اخواں زندگی ہے اس کا پھل
عالمِ عقبیٰ میں ہے سب سے بڑی عزت یہی
عشق ہر صورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے
خود بخود دہنہ سے نکل جاتی ہے ایسی لے ہے یہ
چوں زمینائے محبت خوردہ بودم بادۂ

اے کہ مستانہ مئے حسنِ عقیدت کا ہے تو
اپنی گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی
آڑ میں مذہب کے شوقِ عزت افزائی نہ ہو
یہ تعصب کوئی مفتاح درِ جنت نہیں
کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے
ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو
رہنما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں
اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی
عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا
قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دستِ اجل
عشق اخواں میں اگر مطعون ہو جائے کوئی
پر کہیں نالہ، کہیں شیون، کہیں فریاد ہے
شیشۂ دل سے اچھل جاتی ہے ایسی مے ہے یہ
تا ثریا رفت ایں قوم نجاک افتادۂ

---

[1] مطالب بانگ درا از غلام رسول مہر ص ۴۴۔

اپنے حق کے مانگنے کو رکھ ادب مدِّ نظر — چاہیے سائل کو آدابِ طلب مدِّ نظر
معنیِ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر — چاہیے دنیا کو اس ناداں کی صحبت سے حذر
آپ چوں در روغن افتد نالہ خیز دازِ چراغ — صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزارہا
دیکھ اے جادو بیاں تو نے اگر پروانہ کی — آبرو گر جائے گی اس گوہرِ یک دانہ کی

از سرابِ حبّ ہم جنسانِ خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش [1]

علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "طلبہ علی گڑھ کے نام" اس وقت لکھی جب وہ ولایت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندستان میں انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور علی گڑھ کالج کے طلبہ انگریز اسٹاف اور خاص طور سے انگریز پرنسپل کو علاحدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ نظم جون ۱۹۰۷ء میں مخزن لاہور میں مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی:

"کلام اقبال علی گڑھ کالج میں ہمیشہ سے مقبول ہے اور شوق اور توجّہ سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ مگر پیامِ اقبال جو آج ہم شائع کرتے ہیں نہایت ہی غور سے پڑھے جانے کے لائق ہے۔ طلبۂ علی گڑھ کو خصوصیت سے مخاطب کرنے کی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی آیندہ امیدیں بہت کچھ ان کے ساتھ وابستہ ہیں ورنہ سب پڑھے لکھے نوجوان اس دردمندانہ مشورے کے مخاطب ہو سکے ہیں جو حضرت اقبال نے ان چند اشعار جامع الفاظ اور بلیغ اشارات میں انھیں دیا ہے [2]۔"

اس وقت یہ نظم بارہ اشعار پر مشتمل تھی۔ بانگِ درا میں کل سات شعر انتخاب کیے گئے ہیں جن میں چار شعروں میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل پانچ شعر حذف کر دیے گئے ہیں:

---

[1] کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق ص ۶۴۔
[2] مخزن جون ۱۹۰۷ء ص ۵۷ بحوالہ مطالب بانگِ درا از غلام رسول مہر ص ۱۲۵۔

مستور ہے درونِ جام پر تو مئے برونِ جام
اِس کا مقام اور ہے اُس کا مقام اور ہے
یوں تو پلانے آتے ہیں محفل کو ساقیانِ ہند
لیکن انھیں خبر نہیں یہ تشنہ کام اور ہے
جس بزم کی بساط ہو سرحدِ چیں سے مصر تک
ساقی ہی اس کا اور ہے اور جام اور ہے
اے بزمِ دورِ آخری کس کی تلاش ہے تجھے
تو سجۂ حجاز ہے تیرا امام اور ہے
فانوس کی طرح جیو آتش بہ پیرہن رہو
اے جلنے والو لذّتِ سوزِ تمام اور ہے [۱]

اس نظم کے آخری شعر میں اقبال طلبہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ابھی انگریزوں کے خلاف ہنگامہ کرنے اور انگریز پرنسپل کو ہٹانے کا وقت نہیں آیا ہے۔ اس لیے کہ:

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی [۲]

شاید علامہ اقبال کے علی گڑھ کالج سے اسی تعلق اور پُر خلوص جذبے کی وجہ سے انھیں وہاں کے لیے پروفیسری کا عہدہ پیش کیا گیا تھا۔ لیکن علامہ کسی وجہ سے یہ عہدہ قبول نہ کر سکے۔ بعض لوگوں نے علامہ کو اس سلسلے میں ہدفِ ملامت بنایا چنانچہ وہ خواجہ حسن نظامی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بعض لوگ آپ پر اخباروں میں حملے کرتے ہیں۔ افسوس ہے مسلمانوں میں معمولی اخلاق بھی نہ رہے۔ میں خود علی گڑھ کالج کی پروفیسری نامنظور کرنے سے ہدفِ ملامت ہو رہا ہوں مگر؎

۱؎ نوادرِ اقبال مرتبہ عبدالغفار شکیل ص ۲۵۶۔ ۲؎ بانگِ درا ص ۱۱۹۔

شادم زطعن خلق کہ مرغانِ باغ عشق شاخے کہ سنگ می رسدش آشیاں کنند[1]

۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء کے مکتوب بنام عطیہ فیضی میں پروفیسری سے انکار کی وجہ واضح الفاظ میں اس طرح بتاتے ہیں:

"بلا شبہہ چند روز قبل میں نے علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں قیدِ ملازمت سے آزاد رہنا چاہتا ہوں اور دوسرے میرا ارادہ تو اوّلین فرصت میں اس ملک سے ہجرت کر جانے کا ہے۔ وجہ آپ کو معلوم ہے۔ صرف بھائی جان کی طرف سے مجھ پر جو ایک اخلاقی قرض و فرض مسلط ہے وہ زنجیر پا بنا ہوا ہے میری زندگی حد درجہ تلخ ہے ..... اس مصیبت کا واحد علاج یہی ہے کہ میں اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ جاؤں[2]"

مولانا ظفر علی خاں نے علامہ اقبال کے ایک مقالہ A CURSORY REVIEW OF THE ISLAMIC RELIGION کا اردو ترجمہ "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے کیا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں یہ مقالہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں پڑھا گیا تھا۔[3] اس کے متعلق تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

جب ۱۹۱۴ء میں مولانا شوکت علی نے "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تو علامہ اقبال نے جواب دیا:

"بھائی شوکت! اقبال عزلت نشیں ہے اور اس طوفانِ بدتمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۹۔

[2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۱۱۸۔

[3] سرگذشت اقبال از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۹۹۔

سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہوسکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیے، مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے، یہ چند اشعار میری طرف سے ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔ والسلام [1]

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں خلاّق آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتر بانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہانگیر و جہاندار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشا کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیّل سے فزوں تر ہے وہ نظّارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیّارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا ہے کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھوں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

غنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را [2]

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں پڑی تو مولانا محمد علی جوہر اس کے پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی نے تجویز رکھی:

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۲۵۵

[2] یہ نظم "خطاب بہ نوجوانان اسلام" کے عنوان سے بانگ درا میں ص ۱۹۸ پر درج ہے۔

"ڈاکٹر اقبال سے درخواست کی جائے کہ وہ عہدۂ پرنسپلی کو قبول کرلیں[1]۔"

یہ تجویز منظور ہوئی اور ایک ٹیلی گرام اس مضمون کا علامہ اقبال کی خدمت میں بھیجا گیا۔ گاندھی جی نے بھی اس سلسلے میں علامہ اقبال کو تحریر کیا:

"مسلم نیشنل یونی ورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے۔ اگر آپ اس کا چارج لے سکیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی مہذب رہنمائی میں ترقی کر سکے گی۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور بلا شبہہ علی برادران کی بھی یہی خواہش ہے، میری خواہش ہے کہ آپ قبولیابی کا کوئی راستہ نکال سکیں۔ نئی بیداری کے تقاضوں کے بقدر آپ کے اخراجات کی کفالت کی جا سکے گی۔ براہ کرم پنڈت نہرو کی معرفت الہ آباد کے پتے پر جواب دیجیے[2]۔"

علامہ اقبال نے اس خط کا جواب ۲۹ نومبر ۱۹۲۰ء کو دیا جس میں اپنی مجبوری کا اظہار اس طرح کیا:

"نوازش نامہ پرسوں ملا جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے جن کا ذکر اس وقت کچھ ضروری نہیں، ان حضرات کی آواز پر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ اگرچہ میں "قومی تعلیم" کے شاید حامیوں میں سے ہوں مگر ایک یونی ورسٹی کی رہنمائی کے لیے مجھ میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جو مختلف کشمکشوں اور رقابتوں کی صورت میں جو عموماً ابتدائی حالات میں پیدا ہوتی ہیں، کسی نوزائیدہ ادارے کو چلا سکیں۔ مزید یہ کہ فطری طور پر پرسکون حالات ہی میں کام کر سکتا ہوں[3]۔"

---

[1] اقبال اور جامعہ از عبداللطیف اعظمی۔ جامعہ جنوری ۱۹۷۸ء ص ۷۔

[2] اقبال اور جامعہ " " مارچ " ص ۸۔

[3] اقبال اور جامعہ از عبداللطیف اعظمی۔ جامعہ دہلی مارچ ۱۹۷۸ء ص ۹۔

پہلی دسمبر ۱۹۲۲ء کو خواجہ منظور احمد نے جو اس زمانے میں علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر تھے۔ علامہ اقبال سے مندرجہ ذیل خط کے ذریعہ اس رسالے کے لیے ایک نظم کی فرمائش کی اور سید سجاد حیدر یلدرم سے جو اس زمانے میں رجسٹرار تھے اپنی اس خواہش کی تائید کرائی:

معظمی و محترمی۔

اس عقیدت و شیفتگی کی بنا پر جو طلبۂ علی گڑھ کو ہمیشہ آپ کے کلام اور شخصیت سے رہی ہے، میری آرزو ہے کہ اس سال کانووکیشن کے موقع پر یونی ورسٹی کے ادبی رسالے علی گڑھ میگزین کا جو خاص نمبر نکالا جائے وہ آپ کے کلام اور دستخطی تصویر دونوں سے مزین ہو۔ کانووکیشن نمبر اوائل جنوری میں شائع ہو جائے گا۔ میں آپ کا نہایت احسان مند ہوں گا اگر آپ میری درخواست پر جلد توجہ فرمائیں گے تاکہ تصویر کا بلاک وقت پر تصویر سے تیار کرا کے منگوایا جا سکے۔ میں محترم سجاد حیدر سے بھی درخواست کر رہا ہوں کہ وہ آپ کو تحریر فرمائیں کہ علی گڑھ والے اس شرف و امتیاز کے لیے کس قدر بیتاب اور کس حد تک اس کے مستحق ہیں۔[1]

علامہ اقبال نے اس خط کا جواب سجاد حیدر یلدرم صاحب کو اس طرح دیا:

"ڈیر سجاد! اس خط کے پچھلے صفحے پر چند اشعار لکھتا ہوں۔ اڈیٹر صاحب کو دے دیجیے۔ اس وقت جلدی میں ہوں معاف کیجیے گا۔ علاحدہ کاغذ نہیں لکھ سکا۔"[2]

نظم ملاحظہ کیجیے:

تنہائی

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابے ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری

---

[1] اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۹۳

[2] اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۹۴

ہزار لولوے لالہ ست در گریبانت
درونِ سینہ چوں من گوہر دلے داری
تپید و از لب ساحل رمید و ہیچ نگفت

بہ کوہ رفتم و پرسیدم ایں چہ بیدردی است
رسد بگوشِ تو آہ و فغانِ غم زدۂ
اگر بسنگِ تو لعلے ز قطرۂ خون است
یکے در آ بسخن با من ستم زدۂ
تجود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت

رہِ دراز بریدم زماہ پُرسیدم
سفر نصیب! نصیبِ تو منزلے است کہ نیست
جہاں زپرتوِ سیمائے تو سمن زارے
فروغ داغ تو از جلوۂ دلے است کہ نیست
سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

شدم بحضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر
کہ در جہانِ تو یک ذرّہ آشنائم نیست
جہاں ہتی ز دل و مشت و خاک من ہمہ دل
چمن خوش است ولے در خورِ نوایم نیست
تبسمے بلبِ او رسید و ہیچ نگفت

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے علامہ اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی تھی، غالباً اسی کا اعتراف علاّمہ نے اپنے مکتوب بنام پروفیسر میاں شریف بتاریخ ۱۹ر جنوری ۱۹۲۵ء میں اس طرح کیا ہے :

"علی گڑھ یونی ورسٹی نے میری جو قدر افزائی کی ہے اس کے لیے میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں۔ یہ اعزاز اور بھی گراں قدر ہو جاتا ہے جب میں

یہ خیال کرتا ہوں کہ میرا کوئی حق اس یونی ورسٹی پر نہ تھا اور نہ عام طور پر علی گڑھ تحریک سے میرا کوئی تعلق رہا۔
امید نہیں کہ ایک ہفتہ تک اس شدّت سرما میں سفر کے قابل ہوسکوں لیکن بعد میں انشاء اللہ علی گڑھ ضرور آؤں گا اور جب آؤں گا آپ کی ملاقات سے مسرت حاصل کروں گا امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی سے میرا سلام کہیے[1]"

۱۹۲۵ء میں جلیل قدوائی علی گڑھ میگزین کے جوائنٹ اڈیٹر تھے انھوں نے علامہ اقبال سے میگزین کے لیے ان کے کلام کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں علاّمہ نے انھیں اپنی فارسی غزل بھیجی تھی، جلیل قدوائی لکھتے ہیں :

"۱۹۲۵ء میں علی گڑھ میگزین کا جوبلی نمبر میں نے بحیثیت جوائنٹ اڈیٹر شائع کیا تھا۔ میں نے سیّد سجّاد حیدر یلدرم مرحوم سے سفارشی خط لکھایا تھا۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے خط بھیجا اور ایک فارسی غزل بھی یہ خط اور غزل بلاکہ، بنوا کر ہم نے خاص نمبر میں شائع کی تھی۔ انھوں نے اپنی ایک تصویر بھی عنایت کی تھی، وہ بھی اسی صفحہ پر شائع کی تھی۔ یہ تصویر اب عام ہوگئی ہے جس میں حضرت عینک لگائے "نظریۂ اضافیت" کا مطاکر رہے تھے۔ خط کچھ اس طرح پر تھا" ڈیر سجّاد، جلیل صاحب کا میری طرف سے شکریہ ادا کیجیے۔ ایک غزل حاضر ہے" اس میں غزل وہ تھی جس کے یہ شعر مشہور اور مجھے پسند تھے۔

من ایں علم و فراست باپر کاہے نمی گیرم — کہ از تیغ سپہر بیگانہ سازد مرد غازی را
بہ ہر نرخ کہ ایں کالا بگیری سودمند افتد — بہ زور بازوے حیدر بدہ ادراک رازی را[2]

۱۹۲۸ء کے آخر میں ایک ہفتہ کے لیے علامہ کا علی گڑھ جانا ہوا تھا جہاں سے وہ نہایت اچھے تاثّرات لے کر واپس آئے تھے۔ چنانچہ جب وہ ۵/جنوری ۱۹۲۹ء

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۳۳۔
[2] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۲۸۱۔

کو مولانا عبدالماجد دریا بادی کو خط لکھتے ہیں تو علی گڑھ کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے:

"آپ کا نوازش نامہ کل موصول ہوا جس کے لیے شکریہ قبول فرمائیے، میں بھی ایک ہفتہ کے لیے علی گڑھ گیا تھا، وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سیڈراس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے یونی ورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوگی، آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے[1]"۔

۲۳ر نومبر ۱۹۲۹ء کو علامہ اقبال مسلم یونی ورسٹی اسٹوڈینٹس یونین کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لے گئے تو ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا اور آنریری لائف ممبر شپ پیش کی گئی۔

پروگرام کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

انٹرمیڈیٹ کالج یونین اجلاس (مورخہ ۲۳ر نومبر ۱۹۲۹ء)

(۱) یونین کے ممبران انٹرمیڈیٹ کالج یونین کے ہال میں آٹھ بجے شب اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں گے۔

(۲) تمام مہمان سوا آٹھ بجے تک اپنی نشستوں پر موجود ہوں گے۔

(۳) جلوس ڈرائنگ روم میں مرتب کیا جائے گا اور ساڑھے آٹھ بجے مندرجہ ذیل ترتیب کے ساتھ ہال میں داخل ہوگا۔

ا: سب سے آگے مجلس منتظمہ کے ممبران بر بنائے عہدہ ہوں گے۔

ب: ان کے بعد نائب صدر اور اعزازی معتمد ہوں گے۔

ج: ان کے بعد صدر یونین اور ڈاکٹر سر محمد اقبال ہوں گے۔

د: ان کے بعد اعزازی مہتمم کتب خانہ اور کابینہ کے ارکان ہوں گے۔

(۴) ہال میں موجود تمام حضرات اس وقت تک کھڑے رہے گے جب تک صدر یونین

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۲۹۔

اپنی نشست پر بیٹھ نہ جائیں۔

(۵) شیخ الجامعہ، نائب شیخ الجامعہ، ممبران منتخبہ کمیٹی اور کچھ مہمان شہ نشیں پر بیٹھیں گے۔

(۶) آگے کی نشستوں کی چھ قطاریں عملہ کے ارکان اور مہمان کے لیے مخصوص ہوں گی ۔

(۷) کارروائی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوگی۔

(۸) اعزازی معتمد ڈاکٹر سر محمد اقبال سے یونین کے اعزازی رکن بننے کی درخواست کریں گے۔

(۹) وزارت کے ارکان ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ہاتھ ملائیں گے اور انھیں ہار پہنائیں گے۔

(۱۰) نائب صدر سپاس نامہ پیش کریں گے۔

(۱۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال سپاس نامہ کا جواب دیں گے۔

(۱۲) صدر، ڈاکٹر سر محمد اقبال کا شکریہ ادا کریں گے اور جلسہ کی کارروائی ختم ہونے کا اعلان کریں گے۔

(۱۳) ہال میں موجود تمام حضرات اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک جلوس مقررہ ترتیب کے ساتھ واپس نہ چلا جائے۔[1]

سپاس نامہ جو ممبران ایم یو انٹرمیڈیٹ کالج یونین کی طرف سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی خدمت میں پیش کیا گیا ملاحظہ کیجیے:

"جناب عالی!

آج ہم ارکان مسلم یونی ورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج یونین انتہائی خلوص اور احترام کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آج کی شام ہمارے درمیان آپ کی موجوگی ہمارے لیے گہری مسرت اور ہمت افزائی کا باعث ہے۔ جناب والا! ہمیں پوری طرح احساس ہے کہ آج ہم اپنے قومی شاعر کے ساتھ ہیں، وہی قومی شاعر جس نے ہمارے عہد کو جذبات قوم پرستی سے معمور کر دیا اور زمانے کی رگ و پے میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آج کی شام ہمارے لیے یوں بھی مسرت و انبساط کا باعث ہے کہ شیخ الجامعہ نواب مسعود

---

[1] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۲۴۹

جنگ بہادر کی ذات گرامی بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔

جناب عالی! ہم یہ دیکھ کر فخر محسوس کرتے ہیں کہ نہ صرف ایک منفرد مفکّر کی حیثیت سے آپ کی شہرت ملک کے باہر تک جا پہنچی ہے بلکہ زندگی کے جن اصولوں کی سرفرازی کے لیے آپ نے آواز بلند کی ہے وہ بھی عالم اسلام کے طول و عرض میں مقبول و معروف ہو گئے ہیں۔ آپ کی آواز سے ان اصولوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان کا اثر قبول کیا ہے، ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارے الفاظ اس ذات گرامی کا شکریہ ہرگز نہ ادا کر سکیں گے جس نے مسلمانوں میں خود احترامی اور قوم پرستی کے احساسات پیدا کرنے میں اپنے عہد کے ہر شخص سے بڑا اور نمایاں حصّہ لیا ہے۔ آپ ہمارے لیے وہ سب کچھ لے کر آگے بڑھے ہیں جو ہمارے شاندار ماضی کا خاصّہ تھا۔ آپ کا کلام فارسی شاعری کے شاندار افکار، عربوں کے بیش بہا تصوّرات اور رومی اور عرفی کے پیغامات کا نادر مجموعہ ہے۔ آپ نے نہ صرف قدیم حقیقتوں کو از سر نو زندہ کیا بلکہ ہمیں اس قابل کر دیا ہے کہ ہم ان کی صحیح اہمیت کو سمجھ سکیں۔ آپ نے ہمارے دلوں کو ان پیغامات کی طرف ہمیشہ کے لیے اس طرح پھیر دیا ہے جس طرح سورج مکھی کا پھول ہمیشہ سورج کی طرف مائل رہتا ہے۔ آپ نے اپنے فلسفیانہ افکار کو اپنی شاعرانہ خصوصیات سے حیرت انگیز طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ انفرادیت آپ کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ آپ کی شاعری نے ہمیں متحیّر کر دیا ہے۔ ہمیں اس جیسی کوئی بات اساتذہ کے کلام میں تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کو مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے آراستہ کیا ہے۔ آپ نے نٹشے کے سپرمین کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ آپ کی شاعری میں گوئٹے کی گہرائی اور کانٹ کی گیرائی ملتی ہے۔ آپ نے مغرب کے ان مفکّرین کے ان تصورات کو اس خوبصورتی کے ساتھ اسلامی روایات اور اردو شاعری کی موسیقی و نغمگی سے ہم آہنگ کیا ہے کہ آپ سے قبل برّصغیر کا کوئی شاعر ایسا نہیں کر سکا۔

ہم آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ مسلم یونی ورسٹی میں آج آپ کی آمد ایک تاریخی واقعہ قرار پائے گی اور بعد میں آنے والی نسلیں آپ کو اپنے قابل تعظیم اسلاف میں شمار کریں گی۔

جناب عالی! ہم آپ کی اس عزت افزائی پر فخر محسوس کرتے ہیں جو آپ نے تازیست یونین کا اعزازی رکن بن کر ہمیں بخشی ہے۔ اب جب کہ آپ ہمارے ہو چکے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ اکثر ہمارے ہاں آیا کریں گے تاکہ ہم اپنے دَور کی ایک انتہائی عظیم شخصیت کے قرب سے مستفیض ہوں، اور اسلامی نظریات کو جدید دور کے ایک انقلاب آفریں مفکّر کے ذریعہ سمجھیں۔"

اور جوابی تقریر میں علاّمہ اقبال نے کہا:

"ممکن ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ میں آپ کے سپاس نامہ کے جواب میں ایک ناصح مشفق کی طرح آپ کو کوئی نصیحت کرنے یا بعض نکات حکمت پیش کرنے لگوں گا۔ لیکن میں آپ سے فوراً اور صاف کہے دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کی پند و نصیحت کچھ نہیں اور نہ میرے پاس کوئی نکتۂ حکمت ایسا ہے جو دوسروں کے لیے بطور دستور العمل پیش کر سکوں، مگر پھر بھی میں ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو کتابوں پر نہیں میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ، خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں اس وقت سے بہت سی چیزیں ہم تک وہاں سے پہنچی ہیں، سب سے اوّل چیز انگریزی لٹریچر ہے جو ہمارے بہت سے نوجوان مصنفین کے لیے تخلیق مضامین کا ذریعہ ہوا ہے۔ وہ مضامین جنھوں نے موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں بہت کچھ حصّہ لیا ہے۔ دوسری بات جو ہم کو انگلستان سے ملی ہے وہ افکار کی عادت ہے۔ میرے نزدیک یہ عادت اس ملک کے لیے بہترین نعمت ہے جس نے واقعات کے خلاف اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اور مسلسل طور پر محض خیال آرائیوں سے کام لیتا رہا ہے۔ الغرض فکر ثقیل کی عادت ہم کو انگلستان سے ملی ہے اور درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ "ڈیموکریسی" ہے جس صورت میں یہ "ڈیموکریسی" آچکی ہے اور جو بمقدار کثیر آیندہ آنے والی ہے وہ افسوس ہے کہ میرے دل میں نہیں بھائی۔ ذاتی طور پر میں اس ڈیموکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے مگر خیر اب چونکہ یہ ڈیموکریسی، انگلستان سے آچکی ہے اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ موجودہ نسل نوجوان کے لیے کس قدر مفید ہے۔ واضح ہو کہ

ڈیموکریسی کے معنی، صاف، علی رؤس الاشہاد اور آزادیِ بحث و تمحیص ہیں۔ حضرات! میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کل دنیا کو فتح کر لینا چاہتے ہیں تو آپ کو لازم ہے کہ آپ اچھے مقرر بن جائیں اور یہ مقصد اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ یونین کی روایات کو قائم رکھا جائے۔ ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شایستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں چونکہ ہم جدید تہذیب و شایستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں، اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعہ سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔ اس طریقۂ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔ میں گذشتہ بیس سال میں قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں۔ مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں، اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمح حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہوئی ہے، جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یونی ورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد تو پیدا کر دے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گذشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسد خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔
(نغمہ ہائے مسرت [1])

---

[1] گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص ۱۰۳

علامہ اقبال "انجمن اسلامیہ مدراس" کی تحریک پر چھے خطبات دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن وہ ابتدا میں صرف تین خطبات تیار کر سکے تھے۔ چودہ جنوری ۱۹۲۹ء میں مدراس، میسور اور حیدر آباد میں دے سکے بعد میں تین خطبے اور تیار ہو گئے۔ سر راس مسعود کی درخواست پر علامہ اقبال یہ خطبات علی گڑھ میں بھی دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے، چنانچہ ۱۷ر نومبر کی رات کو لاہور سے روانہ ہو کر وہ ۱۸ر نومبر کی دوپہر کو علی گڑھ پہنچے جہاں:

"..... سٹیشن پر اساتذہ، اکابر اور طلبہ صفیں باندھے اور پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔ حضرت علامہ گاڑی سے اترتے ہی اکابر سے ملے۔ پھر طلبہ نے حضرت کے گلے میں ہار ڈالے اتنے ہار ڈالے کہ حضرت کا چہرہ مبارک پھولوں سے چھپ گیا۔

اسٹیشن سے حضرت علامہ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کے بنگلے پر گئے جو مسلم یونی ورسٹی میں فلسفہ کے چیرمین ہیں۔ اثنائے قیام علی گڑھ میں حضرت علامہ اسی بنگلہ میں مقیم رہیں گے۔ سید راس مسعود صاحب ضروری کام کے لیے بھوپال چلے گئے ہیں اور ۱۹ر نومبر کو آنے والے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین حضرت علامہ سے ملنے کو آئے اور اپنی جدید تالیف "اسلامی ہیئت" کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ پروفیسر مراد نے حضرت علامہ کو یونی ورسٹی کی سیر کرائی، شام کو ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب نے حضرت علامہ کے اعزاز میں اساتذۂ یونی ورسٹی اور بعض دوسرے اکابر کو چائے کی دعوت دی۔ مولانا عبدالعزیز صاحب میمن کے ساتھ علوم مشرقی کی ریسرچ کے متعلق دلچسپ گفتگو ہوتی رہی۔ شام کے وقت خواجہ غلام الدین کے ہاں دعوت طعام تھی۔ لکچر سر راس کے بھوپال جانے کی وجہ سے ایک روز کے لیے ملتوی ہو گیا۔[1]

مسلم یونی ورسٹی میں علامہ اقبال کا پہلا خطبہ

"علی گڑھ ۲۰ر نومبر کل صبح ہی سے علامہ اقبال کے شیدائیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جن میں ڈاکٹر عطاء اللہ شاہ صاحب اور مولانا بے نظیر شاہ صاحب وارثی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر ظفر الحسن نے پھر شام

---

[1] نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء علامہ اقبال کے سفر کی روئیداد اور خطبات از محمد عالم مختار حق ص ۵۷۲

چار بجے حضرت علامہ کے اعزاز میں دعوت چاے کا انتظام کیا تھا۔ سیّد راس مسعود بھی تشریف لے آئے۔ آپ نے ۱۸ر نومبر کو علی گڑھ موجود نہ ہونے کے متعلق حضرت علامہ سے معذرت کی۔ ساڑھے چھے بجے شام کو لکچر کا وقت تھا۔ اس کے لیے اسٹریچی ہال منتخب کیا گیا تھا۔ حضرت علامہ کے ہال میں پہنچنے سے پیشتر سارا ہال حاضرین سے کچھا کچھ بھر گیا تھا۔ سر راس مسعود اور ڈاکٹر ظفر الحسن حضرت علامہ کے ساتھ ہال میں پہنچے، ڈاکٹر صاحب پہلے جلسہ کے صدر تھے۔ آپ نے صدارتی تقریر میں کہا کہ تم سب "اقبال اعظم" کو جانتے ہو۔ مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ میں ان کا کیا تعارف کراؤں۔ میرا تعارف "معروف بالمجہول" کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد سیّد راس مسعود نے حضرت علامہ کے متعلق چند کلمات کہے جن کا بیشتر حصہ انتہائی ذاتی عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ سیّد راس مسعود صاحب نے فرمایا کہ میں دوران سفر یورپ میں ایک موقع پر بیمار ہو کر اسپتال میں پہنچ گیا تو وہاں میری تسکین کا سامان حضرت علامہ کے وہ ایک ہزار اشعار تھے جو مجھے زبانی یاد تھے۔

اس کے بعد حضرت علامہ اپنا خطبہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ آپ نے ابتدا میں وقت کی ضروریات کے لحاظ سے شریعت اسلامی پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے اپنا پہلا خطبہ سنایا۔ جو گذشتہ جنوری میں مدراس میں سنایا جا چکا تھا۔ حاضرین نے سارا خطبہ انتہائی غور و توجہ سے سنا۔ جلسہ ساڑھے چھے بجے سے شروع ہو کر آٹھ بجے تک جاری رہا۔ آخر میں ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب نے حضرت علامہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا[1]

اسلام کا فلسفی اقبال علی گڑھ کے علمی مرکز میں

"علامہ اقبال علی گڑھ کی علمی دنیا کی توجہات کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔

---

[1] نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء علامہ اقبال کے سفر کی روئیداد اور خطبات از محمد عالم مختار حق ص ۵۷۳

ہر وقت آپ کے ارد گرد شائقین کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ۲۰ نومبر کو آپ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی عیادت کے لیے گئے جو عرصہ سے بعارضہ فالج بیمار ہیں۔ صاحبزادہ صاحب علامہ موصوف کو دیکھتے ہی ہا ہا ہا ہا کرنے لگے، کیونکہ فالج کے باعث ان کی زبان چلنے سے رک گئی ہے۔ علامہ موصوف اس حالت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور آبدیدہ ہو گئے۔

عیادت کے بعد علامہ موصوف ڈاکٹر ضیاء الدین کے ہاں تشریف لے گئے جہاں دعوت تھی۔ بہت سے مقتدر حضرات اس دعوت میں شریک ہوئے اور علمی گفتگو ہوتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رشید[1] احمد صدیقی کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور انھیں پہلے کی بہ نسبت صحتیاب پایا۔

---

[1] رشید احمد صدیقی مرحوم اس ملاقات کی روداد اس طرح رقمطراز ہیں:

۱۹۳۰ء (؟) میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انھیں دنوں یاد نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ ایک دن صبح غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ اس روز خاص طور پر بڑی تکلیف تھی، مشکل سے باہر آیا، بڑے افسردہ لہجے میں رک رک کر عرض کیا "ڈاکٹر صاحب کاش اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانا پڑتی۔" ہائے ان کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے لہجے میں فرمانا "نہیں جی صدیقی صاحب! کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ اچھے ہو جاؤ گے۔ پھر لاہور آنا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو۔ مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمان کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے۔"

اس کے بعد میں دیر تک ان کی موجودگی میں بھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں رہ کر عالم بقا کو سدھارے کاش کسی وقت حاضر خدمت ہو کر ان کے لیے وہ کر سکتا جو انھوں نے میرے لیے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں مرحوم بہت بڑے آدمی تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا ہے۔ (اقبال شخصیت اور شاعری از رشید احمد صدیقی ص ۱۹)

یونی ورسٹی کے شعبہ فلسفہ کی طرف سے علاّمہ ممدوح کو حوض شناوری کے پاس چمن میں شام کے وقت ایٹ ہوم دیا گیا جس میں وائس چانسلر اور یونی ورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے، شام کے چھے بجے تک پُرلطف صحبت جمی رہی۔

وہاں سے ڈاکٹر ظفر الحسن کے بنگلے پر سے ہوتے ہوئے یونی ورسٹی یونین ہال میں تشریف لے آئے اور لکچر دیا اور کسل مندی کی وجہ سے ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کے مکان پر چلے گئے۔ ۲۱ر دسمبر کی صبح کو اکثر طلبہ گذشتہ شام کے لکچر کے بعض نقاط[1] کی تشریح کے لیے علاّمہ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور دن کا کھانا نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر کے ہاں کھایا۔ کھانے کے بعد پروفیسر مراد سے مکالمہ ہوتا رہا شام کے وقت ½۶ بجے پھر لکچر دیا جو ۸ بجے ختم ہوا۔ رات کے گیارہ بجے تک پُرلطف صحبت رہی۔ ۲۲ر کی صبح کو پھر تشنگانِ علم اس منبع علوم سے کسبِ فیضان کرنے کے لیے آئے اور دن کا کھانا مسٹر بشیر حسین زیدی کے ہاں تھا۔ شام کی دعوت ڈاکٹر عطاء اللہ صاحب بٹ کے ہاں تھی جنھوں نے بڑے تکلّفات سے کام لیا۔ لوگ ڈاکٹر صاحب سے شعر سننے کے متمنی تھے۔ آپ نے پسند نہ فرمایا۔ صاحبزادہ حمید بٹ نے "یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" نظم پڑھ کر سنائی۔

شام کے وقت مسٹر راس مسعود کے ساتھ یونی ورسٹی کی ترقی کے موضوع پر بات چیت ہوتی رہی۔ رات کو علامہ ممدوح نے "انانیت انسانی اور اس کی لم یزلی" پر تقریر کی، رات کو دیر تک ڈاکٹر ظفر الحسن سے باتیں ہوتی رہیں[2]

---

[1] نکات۔

[2] علاّمہ اقبال کے سفر کی روئیداد اور خطبات از محمد عالم مختار حق۔ نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۵۷۳

علامہ اقبال علی گڑھ یونی ورسٹی میں

(سپاسنامہ کے جواب میں علامہ کی تقریر کے بعد مسٹر ہارون پرو وائس چانسلر اور صدر یونین کی تقریر)

"اب یہ فرض مجھ پر عائد ہوا ہے کہ اپنے ممتاز مہمان عزیز ڈاکٹر سر محمد اقبال کے لیے نوٹ آف تھینکس (شکریہ) پیش کر کے جلسہ ختم کروں۔ مجھے یہ کہنے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں ہے کہ یہ ہفتہ اس قدر پُر از واقعات رہا ہے کہ ہم نے یا یونی ورسٹی نے اب تک نہ دیکھا ہو گا، اس ہفتہ میں سب سے مختلف طریقہ سے اس امر کا شرف عظیم حاصل کر چکے ہیں کہ ایک ایسے صاحب طبع عالی سے نیاز حاصل ہوا، جس کا ذہن نہایت رسا، جذبات وسیع، اور خیالاتِ رفیع سے معمور ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ ایک زبردست روح کے مالک ہیں (نعرہ ہائے مسرت)

آج شام کو جب میں نے اپنے سپاسنامۂ خیر مقدم کے جواب میں سر محمد اقبال کی تقریر سُن رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس تمام تقریر میں نہ صرف ایک پیش گو اور فلاسفر کی آواز سنائی دیتی ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی صدا ہے جس کا وسیع دل زبردست رواداری اور ہمدردی سے معمور ہے۔ (ہیر ہیر) میں بلا رو رعایت یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو کچھ میں نے ہفتہ میں سُنا اور جو کچھ میں نے پُر از واقعات ہفتہ کے اس قابل یادگار جلسہ میں جو اواخر ہفتہ میں واقعہ ہوا سنا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے لیے ڈاکٹر اقبال سے بہتر اور کوئی خضر طریق نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مجھے اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے کی اجازت دیں تو عرض کروں گا کہ میرے لیے یہ ہفتہ عجیب گزرا ہے کیونکہ اگرچہ مجھے ہندستان میں رہتے ہوئے تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں مگر آج ہی میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں نئی روح جاری و ساری ہو رہی ہے۔ ایسا احساس مجھ کو یونی ورسٹی چھوڑا کے بعد سے اب تک نہ ہوا تھا۔ جب میں یونی ورسٹی میں پڑھتا

تھا میں بھی آپ جیسے بعض حضرات کی طرح سے ایک ہونہار فلسفی تھا اور میں بوسانکے اور لارڈ ہالڈین جیسی زبردست ہستیوں کے قدموں میں بیٹھا تھا، لیکن اس زمانہ سے میں ترقی معکوس کرتا رہا مگر اس ہفتہ میں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں پھر اسی زمرہ میں شامل ہو گیا ہوں، فلسفہ سے جو دلچسپی مجھے تھی وہ پھر پیدا ہو گئی ہے نہ صرف فلسفہ بلکہ فلسفہ کے اس شعبہ سے جو مذہب فلسفہ میں سلسلہ ارتباط ہے اس زبردست احسان کے لیے میں ڈاکٹر اقبال کا رہین منت ہوں۔ جسے میں تسلیم کرنا چاہتا ہوں اور قبل ازیں کہ میں یہ جلسہ ختم کردوں میں اپنے فلسفی ڈاکٹر ظفر الحسن کے قول کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے فرمایا تھا کہ وہ دن ہمارے لیے ایک مبارک دن ہوگا اگر ہم ڈاکٹر محمد اقبال کو کسی طرح اپنے ہاں چند سال بسر کرنے پر مائل کر سکیں [1]"

اس سفر میں جلیل قدوائی صاحب اپنی ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"افسوس کہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے مجھے بہت زیادہ مواقع نہیں ہوئے۔ مگر ہاں دو ایک بار شرف نیاز ضرور ہوا تھا۔ علی گڑھ میں جب وہ خطبات مدراس کے سلسلہ کی تقریر فرما چکے تو ایک نشست میں یونین ہال میں جہاں ان کی تقریر ہوئی تھی طلبہ نے ان سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی تھی۔ کہاں تو آپ نہایت باوقار اور سنجیدہ بلکہ فلسفیانہ انداز سے اپنے موضوع پر اظہار خیال فرما رہے تھے مگر شعر سنانے کی فرمائش سنتے ہی آپ کے مزاج کا اعتدال جاتا رہا اور آپ نے نہایت تلخ اور تیز بلکہ غصے کے لہجے میں نوجوانوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور فرمایا کہ جس قسم کی شاعری موصوف نے

---

[1] علامہ اقبال کے سفر کی روئیداد اور خطبات از عالم مختار حق نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۵۷۴

کی وہ محفل گرم کرنے اور مشاعرہ بازی کے لیے نہیں بلکہ اصلاح احوالِ قوم کی خاطر تھی اور چونکہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اس لیے آپ نے شعر کہنا بند کر دیا۔ آپ نے نوجوانوں کو تاکید کی کہ شعر گوئی اور شعر خوانی کی لغویت سے دور رہیں۔

آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے شعر کہنا بند کر دیا مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے متفرق اشعار یا نظمیں کہنی بند کر دی تھیں کیونکہ اس کے بعد آپ کا کلام مجموعوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے بازار میں آیا۔ متفرق کلام آپ نے نہ سنایا نہ رسالوں میں شائع کرایا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل کہتے رہتے تھے اور اسے کتابی صورت میں شائع کراتے تھے۔ جستہ جستہ کہہ کر اور سنا کر اس کا اثر اور وقار ضائع نہ کرتے تھے[1]"

غالباً ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ میں Anti God سوسائٹی بنی تھی جس کی وجہ سے علامہ اقبال بہت رنجیدہ خاطر تھے۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۴ء کو نیازی صاحب کو لکھتے ہیں:

"..... علی گڑھ کے حالات اچھے نہیں سنے جاتے[2]"

۲۱ ستمبر ۱۹۳۴ء کو نیازی صاحب کو پھر لکھتے ہیں:

"..... علی گڑھ کے حالات اچھے نہیں معلوم ہوتے[3]"

اگلے خط میں علی گڑھ کے حالات کی وضاحت کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کے دل پر صدمہ کی کیا کیفیت تھی:

"علی گڑھ کے متعلق جو میں نے لکھا تھا اس سے میری مراد بھی یہی سوسائٹی تھی میں نے کسی سے سنا تھا جس کا مجھے اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کی نماز (میں) گریہ وزاری کی کوئی حد

---

[1] اقبال اور جلیل قدوائی۔ اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۲۸۰۔

[2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۰۰۔

[3] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۰۱۔

نہ رہی لے"

۴ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو نذیر نیازی صاحب کو اپنے علی گڑھ جانے کی اطلاع اس طرح دیتے ہیں :

"...... شاید مجھے علی گڑھ جانا پڑے لے"

پھر ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۴ء کے خط میں صحیح تاریخ وقت اور گاڑی سے آگاہ کرتے ہیں :

"...... لہذا میں فرنٹیر میل سے آؤں گا جو سات بج کر پچپن منٹ پر صبح دہلی پہنچے گی وہاں آدھ گھنٹہ قیام کرکے علی گڑھ روانہ ہوگی جہاں ساڑھے دس بجے پہنچ جائے گی سے"

ان خطوط سے اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ کس کام سے علی گڑھ جا رہے تھے کہاں قیام کا ارادہ تھا اور کب تک واپسی ہونے والی تھی۔ خواجہ غلام السیّدین صاحب بھی ایک بار اقبال کے میزبان بنے تھے لیکن کب ؛ اس کا علم نہیں ہو سکا۔ وہ لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ علی گڑھ میں ان کی میزبانی کا شرف نصیب ہوا۔ جب وہ یونی ورسٹی کی دعوت پر "اسلامی فکر کی تعمیر نو" پر اپنے خطبات دینے وہاں تشریف لائے تھے سے"

اگر ان خطبات کا اشارہ ان خطبات سے ہے جو ڈاکٹر اقبال نے ۷ر نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ میں دیے تھے تو اس دوران میں ان کا قیام ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب کے یہاں ہوا تھا جس کا ذکر پچھلے اوراق میں ہو چکا ہے۔

علامہ اقبال زندگی کے آخری ایام میں جب کہ وہ بیمار تھے اپنے بچوں جاوید اور منیرہ کی تعلیم و تربیت کے لیے پریشان تھے، چاہتے تھے کہ ان کی نگہداشت کے لیے یوپی کی کسی شریف گھرانے کی مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون بطور گورنس کام کرنے پر

لے مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۰۲۔

لے مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۳۱۔

سے " " " ۲۰۲

سے آندھی میں چراغ از خواجہ غلام السیّدین ص ۲۰۲

آمادہ ہو جائیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کو خط لکھا تھا۔ رشید صاحب نے علامہ اقبال کے جواب میں ایک جرمن خاتون مس ڈورا کا نام تجویز کیا۔ انھیں سب آپا جان کہتے تھے۔

علامہ اقبال نے مس ڈورا کے لیے رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی صاحب نے انھیں لاہور روانہ کر دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد مس ڈورا کا خط رشید صاحب کے نام آیا:

"میں تو بہت ڈرتے ڈرتے اس گھر میں داخل ہوئی تھی لیکن چوبیس گھنٹے کی مدت میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کھویا ہوا وہ گھر جو میں برلن میں چھوڑ آئی تھی مجھے واپس مل گیا ہے۔ سر اقبال کی عالمانہ بصیرت اور شہرۂ آفاق قابلیت سے تو میں ناواقف ہوں لیکن ان کی شریفانہ دلنوازی اور مشفقانہ سرپرستی نے مجھے زندگی کی بہت سی ناانصافیاں اور محرومیاں بھلا دی ہیں[1]"

اور علامہ اقبال کا خط رشید احمد صدیقی کے نام آیا تو مس ڈورا کے بارے میں ان کے یہ خیالات تھے:

"جرمن خاتون کی آمد نے میرے تاریک گھر کو روشنی عطا کی ہے۔ میری بچی (بانو) کو مادرانہ شفقت کا بیش بہا ذخیرہ خدا کریم کی مہربانی سے عطا ہوا ہے۔ اللہ کریم آپ کو اس کا اجر دے گا[2]"

اس طرح علامہ اقبال کا علی گڑھ سے جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ ان کی آخری عمر تک قائم رہا۔ مس ڈورا اس رشتہ کی آخری کڑی ہوئیں جن کی وجہ سے علامہ اقبال کو زندگی کے آخری ایام میں بہت سکون نصیب ہوا۔

---

[1] سر اقبال اپنے گھر میں از سلمیٰ صدیقی قومی راج بمبئی اقبال صدی خصوصی نمبر ۲۵ / دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۸

[2] " " " " " " " "

اقبال اور پانی پت

علامہ اقبال کے دل میں مولانا الطاف حسین حالی کے لیے نہایت عقیدت اور احترام کا جذبہ تھا۔ اسی وجہ سے جب ۱۹۰۴ء میں مولانا حالی انجمن حمایت اسلام کی دعوت پر اس کے سالانہ جلسہ میں شریک ہونے کے لیے لاہور تشریف لائے لیکن ضعیفی اور نقاہت کی وجہ سے اپنا کلام نہیں پڑھ سکے تو علامہ اقبال سے جو وہاں موجود تھے درخواست کی گئی کہ وہ مولانا کا کلام سنائیں۔ علامہ اقبال تیار ہو گئے لیکن مولانا کا کلام سنانے سے پہلے مندرجہ ذیل رباعی اسی وقت کہہ کر سنائی ؎

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمورِ مئے حق سے ہے جام حالی
ہیں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا — نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی[1]

علامہ اقبال کے یہاں مولانا حالی سے عقیدت اور محبت کا یہ جذبہ ہمیشہ رہا چنانچہ جب مولانا حالی کی صد سالہ یومِ ولادت کے سلسلے میں پانی پت میں ۲۶/۲۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کی تاریخیں مقرر ہوئیں اور مولانا حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین نے علامہ اقبال کو اس جشن میں شریک ہونے کی دعوت دی تو علامہ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو مندرجہ ذیل خط کے ذریعہ اپنی شرکت کی رضامندی کا اظہار کیا۔

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۳۸۔

۱۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء

مخدوم و مکرم جناب خواجہ صاحب ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا والا نامہ مل گیا ہے اگر میری صحت اچھی رہی تو میں انشاء اللہ ۲۴ر یا ۲۵ر اکتوبر کو ضرور حاضر ہوں گا۔ مسعود (سر راس مسعود) کا خط آپ کے ساتھ ہی ملا، وہ لکھتے ہیں کہ میں ۲۵ر یا ۲۴ر کو پانی پت پہنچ جاؤں گا۔ بہرحال انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ میرے ساتھ لاہور کے ایک دو احباب بھی غالباً اس مبارک تقریب میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں۔ چند اشعارِ فارسی میں نے لکھے ہیں جو اعلاحضرت کی تشریف آوری کے موقع پر جلسہ کے آغاز سے پہلے پڑھ دیے جائیں تو خوب رہے گا۔ کاش میں خود پڑھ سکتا۔ گلے کی خرابی سے یہ بات ممکن نہیں آپ انھیں کسی ایسے نوجوان کو یاد کرا دیں جو فارسی درست پڑھ سکتا ہو اور خوش الحان ہو۔ اشعار جب آپ کا ارشاد ہوگا ارسال خدمت کروں گا[1]

والسلام مخلص

محمد اقبال

اور اسی دن ۱۲ر ستمبر ۱۹۲۵ء کو نذیر نیازی صاحب کو بھی اپنے پانی پت کی روانگی کے پروگرام سے آگاہ کرتے ہیں۔

"مولانا حالی کی سالگرہ کی تاریخ ۲۶ر ۲۷ر اکتوبر مقرر ہوئی ہے۔ میں غالباً ۲۵ یا ۲۶ر اکتوبر کو وہاں پہنچ جاؤں گا۔ آپ کے رسالے کے (لیے) یہ بہتر ہوگا کہ اگر ممکن ہو تو آپ خود وہاں پہنچ جائیں اور اگر فوٹو گراف کا بھی انتظام کر سکیں تو اور بہتر ہو۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے وہاں میں آپ کو سید راس مسعود سے بھی انٹروڈیوس کراؤں گا۔ چودھری محمد حسین اور جاوید بھی ساتھ ہوں گے[2]"

پروگرام کے مطابق علامہ اقبال ۲۵ر اکتوبر کو پانی پت پہنچے، ان کے ہمراہ جاوید اقبال بھی تھے۔ سید نذیر نیازی، راجا حسن اختر اور چودھری محمد حسین بھی شریک اجلاس تھے۔

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۲۹

[2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۹۴

علامہ کا قیام حالی مسلم اسکول کے کسی کمرے میں تھا' اسی اسکول میں جشن ولادت کا جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ نذیر نیازی پانی پت میں علامہ سے ملاقات کے بعد اپنے تاثرات اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"اکتوبر کے آخری ہفتہ میں پانی پت پہنچا لیکن یہ دیکھ کر کہ حضرت علامہ کے چہرے پر زردی چھا رہی ہے، اور آواز کا ضعف بھی بہت کچھ بڑھ گیا ہے بڑا دکھ ہوا، معلوم ہوتا تھا لاہور سے پانی پت کا سفر بھی ان کی برداشت سے باہر ہے حالانکہ ابھی چند ہفتے پیشتر جب آخر اگست میں وہ بھوپال سے واپس آئے ہیں تو ضعف اور اضمحلال کی یہ کیفیت نہیں تھی"۔[۱]

پانی پت میں علامہ اقبال کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری خواجہ احمد عباس کے سپرد تھی، وہ لکھتے ہیں۔

"اس وقت میں ۱۲ برس کا لڑکا تھا اور علامہ اقبال کی خدمت کا فرض میرے سپرد تھا میرے لیے یہ بڑی خوشی اور فخر کا مقام تھا کہ اتنے بڑے شاعر کی خدمت میں حاضر رہوں' اُن کے حقے پانی کا انتظام کروں، ان کے لیے دسترخوان بچھاؤں اور ان کے لیے کھانا لگاؤں اگرچہ میری یہ خواہش کہ ان کا کلام ان کی ہی زبان سے سن سکوں پوری نہ ہو سکی[۲] . . . "

۲۶ اکتوبر کے اس اجلاس میں جس کی صدارت نواب حمید اللہ خاں فرما رہے تھے علامہ اقبال بھی اسٹیج پر نواب صاحب کے ساتھ تشریف رکھتے تھے۔ سپاسنامہ کے بعد حفیظ جالندھری نے ترنم سے ایک نظم سنائی' اس کے بعد حالی مسلم اسکول کے ایک اُستاد نے اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے ؎

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می بینم — چوں محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم
حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو — ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را — نوائے او بجانہا افگند شورے کہ می دانم

---

[۱] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۳۰۱

[۲] اقبال، حالی اور ہریانہ از خواجہ احمد عباس تعمیر ہریانہ فروری ۱۹۷۸ء ص ۶

بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم[1]

اس جلسہ کے بعد والیِ بھوپال جب تشریف لے گئے تو علامہ اقبال نے بھی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے اجازت چاہی۔ اس سلسلے میں نذیر نیازی صاحب رقم طراز ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ہوا یہ کہ والیِ بھوپال واپس تشریف لے گئے تو حضرت علامہ بھی جو اِن دنوں خلافِ امید بہت زیادہ نقاہت اور ضعف محسوس کرتے تھے جلسہ گاہ سے اُٹھ آئے۔ انھیں اس وقت بے حد آرام کی ضرورت تھی، چنانچہ حضرت علامہ نے اول تو کچھ آرام فرمایا پھر کھانا کھایا علی بخش حقّہ بھر کر لے آیا۔ چودھری صاحب مرحوم، راجا صاحب اور راقم الحروف خدمت کے لیے حاضر تھے، مجھ سے حکیم صاحب قبلہ کے بارے میں استفسار فرمایا۔ اپنے خطوں اور دوا و پرہیز کا ذکر کرنے لگے۔ میں حکیم صاحب قبلہ سے مل کر سب حالات عرض کر چکا تھا۔ دوائیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔ دوا اور پرہیز کے بارے میں ان کا اطمینان ہوا تو حسبِ معمول کچھ نیند لی، پھر باتیں ہونے لگیں۔ سہ پہر میں دارالاقامہ کے میدان میں نشست رہی۔ چائے کا اہتمام ہوا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا، شام کو میدان سے اٹھ کر پھر کمرے میں تشریف لے آئے۔ اس دوران میں بھی جو حضرات ملنے کے لیے آئے ان کی باتوں کا اپنی دھیمی اور کمزور آواز میں جواب دیتے رہے، اس اثنا میں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک صاحب بار بار آتے اور ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے وہیں پاس ہی کچھ کاغذات پمفلٹ پھینک دیتے، یہ صاحب شلوار کوٹ پہنے تھے، خشخشی سی داڑھی تھی، سر پر چھوٹی سی پگڑی، ان کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کسی تبلیغی جماعت کے کارکن ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ جو پھر مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے تو کسی نے کہا یہ آپ کیا پھینک رہے ہیں، ان کا بہ عجلت پمفلٹوں کو تپائیوں پر رکھنا اور اُلٹے پاؤں بھاگ جانا "پھینکنے" ہی کے مترادف تھا۔ کہنے لگے یہ ہماری جماعت کا لٹریچر ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا، یہ کون صاحب ہیں؟ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے عرض کیا مبلّغ ہیں۔ فرمایا یہ تو بڑی اچھی بات ہے اور پھر ارشاد ہوا ان سے کہیے ہم سے اتنے خائف کیوں ہیں۔ بار بار تکلیف فرماتے ہیں کیوں نہ ہم سے بیٹھ کر باتیں کریں ہمیں سمجھائیں، ہم ان

---

[1] سرود رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۹۴

سے سیکھیں لیکن ہمارا ان سے یہ کہنا تھا کہ وہ مسکراتے اور پھر اسی تیزی سے جس سے اس مرتبہ انھوں نے جھلک دکھائی تھی غائب ہو گئے [۱]

شام کے جلسہ میں علامہ اقبال کمزوری اور تھکان کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے جس کی وجہ سے حاضرین جلسہ کو بڑی مایوسی ہوئی — صاحب نوائے فردا جناب ایوب لکھتے ہیں :

"...... جب شام کے وقت پہلے دن کی دوسری نشست منعقد ہوئی تو اہل مجلس کی نظریں پوری بے تابی کے ساتھ ڈائس کی جانب لگی ہوئی تھیں کہ علامہ کب تشریف لاتے ہیں جب پنڈال پُر ہو گیا اور جلسہ کی کارروائی کی ابتدا کا وقت آیا تو ڈائس سے یہ اعلان ہوا کہ علامہ اقبال کی طبیعت قدرے ناساز ہے اس لیے وہ اس اجلاس میں تشریف نہیں لا سکے لیکن وہ کل صبح کے جلسہ میں ضرور تشریف آور ہوں گے۔ اس اعلان نے بے تابیِ شوق کو تلخیِ انتظار کی دعوت دی .. [۲]

دوسرے دن صبح کے جلسہ میں بھی علامہ شریک نہیں ہو سکے اور ڈائس سے اعلان ہوا :

"...... علامہ اقبال ایک ضروری کام کے سلسلے میں دلّی گئے ہیں دوپہر تک واپس تشریف لے آئیں گے اور شام کے اجلاس میں شرکت فرمائیں گے [۳]"

صاحب نوائے فردا ایوب صاحب بیان کرتے ہیں کہ اس اعلان کے بعد محسوس ہوا کہ اب علامہ کسی نشست میں شریک نہیں ہوں گے، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دلّی واپس جانے کے لیے بعد دوپہر گاڑی کی آمد سے بیس منٹ پہلے اسٹیشن پہنچے تو عجیب واقعہ پیش آیا۔ لکھتے ہیں۔

"...... گاڑی کے انتظار میں ویٹنگ روم میں جو داخل ہوئے تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہ دیکھا کہ علامہ اقبال وہاں پر تشریف فرما ہیں۔ تھوڑی دیر بعد

---

[۱] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۵۔

[۲] " " ص ۳۴۴

[۳] " " ص ۳۴۴

ایک گاڑی دلّی کی جانب سے آنے والی تھی جس میں علامہ لاہور کا سفر اختیار کرنے والے تھے۔ علامہ موصوف کو دیکھنے کا عمر بھر میں میرا یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔ جب میری نظر ان پر پڑی تو مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے انسانی عظمت کا کوئی ہمالیہ میرے سامنے آگیا ہو۔ اس وقت میری عمر کوئی ۲۴ برس کی تھی میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور کوئی ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر ایک بنچ پر دم بخود بیٹھ گیا۔ کمرے میں چند نفوس اور بھی تھے ایک صاحب نے جو غالباً ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھے جرأت کر کے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کیا "ہم نے سنا تھا کہ جناب وائسرائے سے ملاقات کی غرض سے دلّی تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کے دلّی تشریف لے جانے کا اعلان تو آج صبح کے جلسہ میں بھی ہوا تھا۔" اس سوال کے جواب میں علامہ نے اپنی بیٹھی ہوئی مگر جلال آگیں آواز میں فرمایا "فقیر کا وائسرائے سے کیا کام ہے"[1]

اور ان میں ایک صاحب نے علامہ کے وہ اشعار جو ان کی طرف سے پہلے جلسہ میں پڑھے گئے تھے اور ایک کاغذ پر لکھے ہوئے تھے علامہ کی طرف یہ کہہ کر بڑھائے کہ "آپ انھیں ملاحظہ فرما کر یہ فرمائیں کہ میں نے لکھنے میں کوئی غلطی تو نہیں کی" علامہ نے نیازی صاحب کو دکھانے کے لیے اشارہ کیا، ایوب صاحب بیان کرتے ہیں:

"ادھر نیازی صاحب نے ان اشعار کی صحت پر صاد کیا اور ادھر لاہور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آپہنچی۔ علامہ وہاں سے اٹھے اور آکر گاڑی میں تشریف فرما ہوئے۔ چند منٹ بعد گاڑی جا چکی تھی، لیکن اتفاقی ملاقات کے ناقابل فراموش تاثرات و تصورات اپنی جگہ پر قائم تھے۔"[2] نیازی صاحب کے تاثرات ملاحظہ کیجیے:

پانی پت میں حضرت علامہ کا قیام دو روز رہا انھوں نے تقریب میں شرکت فرمائی حضرت شاہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر عقیدت مندانہ حاضری دی۔ احباب اور نیاز مندوں سے باکرام والتفات پیش آئے اور پھر چودھری محمد حسین صاحب مرحوم، راجا حسن اختر جاوید سلمہٗ اور علی بخش کی معیّت میں لاہور واپس تشریف لے گئے مگر پھر

---

[1] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۳۴۸

[2] " " " " ص ۳۴۹

یہ امر بڑا تکلیف دہ تھا کہ اس تقریب میں حضرت علامہ اگرچہ مسند پر تشریف فرما رہے لیکن نہ اپنا مشہور قطعہ

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

خود پڑھ سکے نہ تعریفی کلمات کے جواب میں بطور تشکر ہی کچھ فرمایا جو اعلا حضرت نواب صاحب بھوپال اور دوسرے حضرات نے ان کی شان میں کہے[۱]"

آگے لکھتے ہیں:

"..... پانی پت میں حضرت علامہ کی صحت کو دیکھ کر جو اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ صحیح نکلا، میں نے پریشان ہو کر حکیم صاحب قبلہ سے اس کا ذکر کیا تو انھیں بھی تشویش ہوئی[۲]"

۱۸/ نومبر ۱۹۳۵ء کے خط میں علامہ لاہور سے لکھتے ہیں:

"یقین جانیے کہ مجھے پانی پت کے سفر میں تکلیف ہوئی اب جو کچھ قوت سفر باقی ہے اسے بھوپال کے سفر کے لیے محفوظ رکھتا ہوں۔[۳]"

اس کے بعد علامہ کی صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی، یہ سرزمین پانی پت کی خوش نصیبی تھی کہ اس کے فرزند جلیل خواجہ الطاف حسین حالی سے گہرے تعلق عقیدت اور محبت کی وجہ سے علامہ اقبال تکلیف دہ مرض اور کمزوری کے باوجود پانی پت کے کے لیے سفر تیار ہو گئے۔ ان کا پانی پت کا یہ سفر اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

---

۱ مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۳۰۲

۲ " " " " ص ۳۰۲

۳ " " " " ص ۳۰۲

اقبال اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مشہور سیاسی رہنما، قومی کارکن، ہمدرد قوم و ملّت، مشہور و معروف حکیم نابینا (حکیم عبدالوہاب انصاری) کے چھوٹے بھائی تھے جن کا ذکر مکتوبات اقبال (نذیر نیازی) اور اقبال کے دوسرے خطوط میں بار بار آیا ہے۔ ڈاکٹر انصاری سے بھی علامہ اقبال اپنے علاج کے سلسلے میں مشورہ لیا کرتے تھے، یہ عجیب لطف کی بات ہے کہ ڈاکٹر انصاری بہت پہلے سے ہی نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) کے بھی معالج تھے۔ محمد غالب منیجر ڈاکٹر انصاری کے مکتوب بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی ۹ جنوری ۱۹۱۷ء سے اس کا پتا چلتا ہے کہ شاید وہ ۱۹۱۷ء کے پہلے سے ہی نواب زادہ حمید اللہ خاں کے ذاتی معالج رہ چکے تھے۔ محمد غالب رقم طراز ہیں:

"..... فی الحال ڈاکٹر صاحب بسلسلۂ علاج جناب صاحبزادہ حمید اللہ خاں صاحب بھوپال تشریف لے گئے ہیں اور نہیں معلوم کب واپس ہوں۔"[1]

ڈاکٹر انصاری کا تعلق اقبال سے کب سے ہوا، اس کا پتا تو نہیں چلتا لیکن اقبال کے فروری، مارچ ۱۹۱۹ء کے خط بنام گرامی سے اس کا علم ہوتا ہے کہ فروری، مارچ ۱۹۱۹ء سے یا اس سے قبل ہی سے دونوں کے درمیان تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

---

[1] خطوط نمبر (حصہ دوم) نقوش لاہور: محمد طفیل ص ۱۰۱

"میں ابھی تک علیل ہوں، کسی قدر افاقہ ضرور ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذالک دو چار روز میں دہلی جانے کا قصد ہے کہ حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری سے مشورہ کروں [۱]"

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی، جس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی جوہر ہوئے، انھوں نے ہی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ (۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء) میں ایک تجویز پیش کی کہ علامہ اقبال سے درخواست کی جائے کہ وہ شیخ الجامعہ کا عہدہ قبول کر لیں۔ گاندھی جی سے بھی درخواست کی گئی کہ وہ علامہ اقبال کو اس سلسلے میں خط لکھیں اور اس عہدے کو قبول کرنے کے لیے درخواست کریں، چنانچہ گاندھی جی نے نومبر ۱۹۲۰ کے آخری ہفتہ میں حسب ذیل خط علامہ اقبال کے نام تحریر کیا:

ڈیر ڈاکٹر اقبال!

مسلم نیشنل یونی ورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے، اگر آپ اس کا چارج لے سکیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی مہذب رہنمائی میں ترقی کر سکے گی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور بلاشبہ علی برادران کی بھی یہی خواہش ہے، میری خواہش ہے کہ آپ قبول یا بی کا کوئی راستہ نکال سکیں۔ نئی بیداری کے تقاضوں کے بقدر آپ کے اخراجات کی کفالت کی جا سکے گی۔

براہ کرم پنڈت نہرو کی معرفت الہ آباد کے پتے پر جواب دیجیے [۲]

آپ کا

ایم۔ کے گاندھی

جس کے جواب میں معذرت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ۲۹ نومبر ۱۹۲۰ء کو لاہور سے تحریر کیا:

"۔۔۔۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے جن کا ذکر اس

---

[۱] مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۱۵۶

[۲] اقبال اور جامعہ: عبداللطیف اعظمی جامعہ جنوری فروری ۱۹۷۸ء ص ۸

وقت کچھ ضروری نہیں، ان حضرات کی آواز پر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے۔"[1]

ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ڈاکٹر انصاری اور جامعہ ملیہ کے دوسرے حضرات جن کا تعلق اس کے بانیوں سے ہی تھا بڑے اچھے تعلقات تھے۔ جو کبھی ٹوٹے نہیں، عبداللطیف اعظمی صاحب نے یہ بات صحیح تحریر کی ہے۔

"باوجود اس کے کہ جامعہ کا قیام ایک مخصوص سیاست کا نتیجہ تھا اور اقبال کے سیاسی خیالات ان لوگوں کے خیالات سے مختلف تھے جن کا جامعہ کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مثلاً گاندھی جی، مولانا محمد علی مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ مگر اس کے باوجود دونوں کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور خوشی کی بات ہے کہ آخر وقت تک اس میں کوئی ناخوشگواری پیدا نہیں ہوئی۔"[2]

چنانچہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی امداد کے لیے جب اپیل کی گئی تو اس میں ذوالفقار علی خاں، آفتاب احمد خاں، ابوالکلام آزاد، اجمل خاں کے علاوہ پہلا نام محمد اقبال کا اور آخری نام ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا بھی تھا۔[3]

۱۰ر مئی ۱۹۳۱ء کو نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال نے جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے حامی مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس بلائی تھی جس میں سر محمد شفیع مولانا شوکت علی، جناب تصدق احمد شیروانی، شعیب قریشی وغیرہ کے علاوہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور علامہ اقبال بھی شریک ہوئے تھے جہاں کھل کر تبادلۂ خیال ہوا۔ مختلف فارمولوں کی جانچ پرکھ ہوئی۔[4]

اور ۱۲ر مئی ۱۹۳۱ء کو بھوپال سے واپسی پر دہلی ریلوے اسٹیشن پر نمایندہ اسٹیٹس مین

---

[1] اقبال اور جامعہ: عبداللطیف اعظمی: جامعہ دہلی جنوری مارچ ۱۹۷۸ء ص ۵۰

[2] " " " " " " ص ۱۴

[3] گفتار اقبال: محمد رفیق افضل ص ۱۱۹

[4] سرگذشت اقبال از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۳۲۸

سے ایک ملاقات کے دوران میں علامہ اقبال نے کہا :

" بھوپال کانفرنس کے متعلق اخبارات میں جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں وہ اصول اساسی کے اعتبار سے درست ہیں، لیکن ہم یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بیان صحیح نہیں کہ ہم دونوں مولانا شوکت علی اور سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر جداگانہ نیابت کے مؤیّد رہے اور ڈاکٹر انصاری اور مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی مخلوط نیابت کی حمایت پر اڑے رہے۔ ہم چاروں دہلی کی قرار دادوں کے مؤیّد تھے لیکن مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر متضاد مقاصد کی خاطر جدوجہد نہیں کر رہے تھے۔ جب کہ واقعات کا سامنا ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں میں بہت تھوڑا اختلاف رایے ہے ہمیں یقین ہے جس طریقہ پر یہ کام شروع ہوا ہے اس طرح یہ خفیف اختلاف بھی جاتا رہے گا[1]"

پھر ۵ ارمئی ۱۹۳۱ء کو بھوپال کانفرنس کے فیصلوں سے متعلق بھی علامہ نے بیان دیا :

" شملہ سے ایسوسی ایٹیڈ پریس کا ایک پیغام بدیں مضمون شائع ہوا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب قریشی شملہ پہنچتے ہی گاندھی جی کے مکان پر گئے اور انھیں اطلاع دی کہ ہز ہائی نس والیِ بھوپال نے جن اصحاب کو مدعو کیا تھا، انھوں نے ایک عارضی میثاق مرتب کر لیا ہے، اس پیغام میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس میثاق میں جو فارمولا پیش کیا گیا ہے اس میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب والوں کا امتزاج پایا جاتا ہے اور تقریباً دس سال تک نافذ رہے گا اور اس کے بعد ہر جگہ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے گا، چونکہ میں بھی مدعو تھا، اس لیے میں یہ ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کانفرنس کے غیر مباحث کو بمنزلہ عارضی میثاق پیش کیا ہے

---

[1] گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص ۱۱۹

تو انھوں نے یقیناً نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ انھوں نے گفت وشنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی ۔ ۔ ۔[۱]"

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر انصاری اور جناب تصدق احمد شیروانی نے علامہ اقبال کی خدمت میں تار بھیجا کہ "جس طرح اچھوتوں کی شکایات دور ہوگئی ہیں اسی طرح ہندو مسلم اور سکھ کے سوال کو حل کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی جائے" جس کا جواب علامہ اقبال نے حسب ذیل دیا تھا:

"اس تار سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شیروانی یہ چاہتے ہیں کہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک کانفرنس فرقہ وارانہ سوال کو حل کرنے کے لیے منعقد کی جائے نہ کہ مسلمان لیڈروں کی کانفرنس۔ جس قسم کی کانفرنس ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شیروانی چاہتے ہیں اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اکثریت کی طرف سے ہمارے سامنے مفاہمت کی معیّن تجاویز پیش کی جائیں، ان حالات کے پیش نظر میں مولانا شوکت علی، مسٹر عبدالمجید سندھی اور دیگر اصحاب سے جو کانفرنس میں آنے والے ہیں دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کی تجویز اس وقت تک ملتوی کر دیں جب تک ہندو رہنماؤں کی طرف سے ہمارے سامنے تجاویز پیش نہ کی جائیں[۲]"

ڈاکٹر انصاری کی بڑی خواہش تھی کہ غازی رؤف بے جو جنگ طرابلس اور بلقان کے مشہور و معروف مجاہد تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تشریف لائیں اور توسیعی خطبہ دیں۔ چنانچہ غازی رؤف بے نے مارچ ۱۹۳۳ء میں دہلی آنے کی منظوری دے دی تھی، طے یہ ہوا کہ وہ جامعہ میں چھ لکچر دیں گے جن میں کم سے کم دو کی صدارت علامہ اقبال کریں گے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے علامہ کو اس سلسلے میں ایک خط لکھا، چونکہ ڈاکٹر انصاری سے بھی علامہ کے بڑے اچھے تعلقات تھے اس لیے انھوں نے بھی علامہ کو دہلی آنے کی

---

۱ گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص ۱۲۹

۲ " " " ص ۱۱۹

دعوت دی جس کا اظہار علامہ نے اپنے مکتوب بنام خواجہ عبدالوحید میں کیا ہے جن کی خواہش تھی کہ غازی رؤف بے جامعہ ملیہ میں لکچروں کا سلسلہ ختم کر کے لاہور تشریف لائیں اور وہاں بھی لکچر دیں، مکتوب اقبال فروری ۱۹۳۳ء ملاحظہ کیجیے :

جناب خواجہ صاحب

ابھی تک جواب نہیں "آیا"، مگر امید ہے کہ آج شام تک آجائے گا۔ اور اگر انھوں نے تار کی جگہ خط لکھا تو کل صبح جواب ملے گا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انصاری کا تار ابھی آیا ہے کہ دہلی آکر رؤف پاشا کے لکچر کی صدارت کروں۔ یہ لکچر ۴ر ۶ر ۸ر مارچ کو ہوں گے۔ میں ان کے لکچر کی صدارت کے لیے جاؤں گا مگر واپس آنے کے بعد تاریخ مقرر کرسکوں گا۔ آپ آج شام کو پھر دریافت کریں تو شاید میں کوئی مستقل جواب دے سکوں[1]

علامہ اقبال کے مکتوب بنام نذیر نیازی ۸ر مارچ ۱۹۳۳ء سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ علامہ صدارت کی تاریخ میں تبدیلی چاہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

آپ کا خط ابھی ملا ہے، اگر تبدیلی ناممکن ہے تو بڑی مشکل ہوگی۔ آپ کوشش کریں کہ آخری لکچر کا وقت میری صدارت کے لیے ہو، اور آخری لکچر ۱۸ کو ہو، اگر ناممکن ہو تو میں ۱۹ر مارچ کی شام کو یہاں سے روانہ ہوکر ۲۰ کی صبح کو دہلی پہنچ جاؤں گا لیکن اگر ڈاکٹر انصاری یہ مان جائیں کہ آخری لکچر ۱۸ کو ہو تو مجھے تار دے دیجیے۔ باقی خیریت ہے۔ ۲۰ر مارچ کی صبح (یا جیسی صورت حال ہو) آپ مجھے اسٹیشن پر ملیں[2]

ڈاکٹر اقبال کی جلسے کی صدارت کے لیے رضا مندی پر ڈاکٹر ذاکر حسین بہت خوش ہوئے لیکن چونکہ پروگرام کا اعلان ہوچکا تھا اس لیے طے ہوا کہ علامہ سے ۱۸ر مارچ کے لیے درخواست کی جائے چنانچہ درخواست کی گئی اور علامہ نے منظور کر لی۔ جس کا

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۲۱۰

[2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۵

شکریہ ڈاکٹر انصاری نے خط لکھ کر ادا کیا اور نذیر نیازی صاحب کو حکم دیا کہ لاہور جا کر علامہ کو اپنے ساتھ لائیں، نذیر نیازی صاحب تحریر کرتے ہیں:

اس اثنا میں ڈاکٹر صاحب مرحوم (ڈاکٹر انصاری) اپنی طرف سے تو شکریہ کا خط لکھ ہی چکے تھے۔ لیکن ۱۶ مارچ کی شام کو حکم ہوا اور ذاکر صاحب نے اصرار کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں، اور ۱۸ کی صبح کو حضرت علامہ کو ساتھ لیے واپس آجاؤں۔ لہذا ۱۷ کی صبح میں لاہور پہنچا۔ حضرت علامہ ایک طرح منتظر تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اوّل ڈاکٹر انصاری مرحوم اور غازی موصوف کی خیریت مزاج دریافت کرتے رہے پھر احباب جامعہ بالخصوص ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کا پوچھا۔ باتوں باتوں میں ل؂۔"

پروگرام کے مطابق علامہ اقبال نذیر نیازی کے ساتھ دہلی پہنچے۔ خیر مقدم کے سلسلے میں نذیر نیازی صاحب نے لکھا ہے:

صبح دہلی پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر احباب جامعہ کے علاوہ بعض اور نیاز مند بھی خیر مقدم کے لیے موجود تھے، حضرت علامہ اسٹیشن سے سیدھے "دار السلام"؂ تشریف لے گئے؂

خواجہ حسن نظامی اپنے ہفتہ وار "روزنامچہ" دہلی مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں:

"۱۳؂ مارچ ۱۹۳۳ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال: بارہ بجے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ملنے گیا جو ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر مقیم ہیں۔

ل؂ مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۶

؂ دریا گنج میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا دولت کدہ

؂ مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۷

؂ ۱۳ مارچ یا ۱۸ مارچ۔ دسنوی

نواب بہادر یار جنگ ان کے بہت ہی مدّاح اور معتقد ہیں، میں نے نواب صاحب کا ڈاکٹر سر محمد اقبال سے ان الفاظ میں تعارف کرایا ..."[1]

علامہ اقبال شام کے وقت ڈاکٹر ذاکر حسین، غازی رؤف پاشا اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ جامعہ ملیّہ اسلامیہ تشریف لائے جہاں محمد علی ہال میں جلسہ ہوا، ڈاکٹر انصاری نے جلسہ کی کارروائی شروع کرتے ہوئے علامہ اقبال کا شکریہ ادا کیا اور اُن سے صدارت کی درخواست کی علامہ اقبال نے بھی :

"....چند کلمات میں ڈاکٹر صاحب مرحوم اور غازی موصوف کا شکریہ ادا کیا اور پھر ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ ان کی کوششوں سے عالم اسلام کے ایک فرزند جلیل نے ارضِ ہند کو اپنے ورود سے، سرفراز فرمایا اور اس طرح باہم تبادلۂ خیالات کا موقع پیدا ہوا۔ پھر غازی موصوف سے فرمایا کہ حاضرین جلسہ سے خطاب کریں[2]"

چنانچہ غازی رؤف پاشا نے اپنا مقالہ "وطنیت اور اتحاد اسلامی" پڑھا۔ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ علامہ نے صدارتی تقریر کی اور کلام سنایا۔ چونکہ علامہ کو ایک اور جلسہ کی صدارت کرنی تھی اس لیے :

"دو چار روز ڈاکٹر انصاری کے یہاں خوب چہل پہل رہی، دن بھر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا اور اس میں غازی موصوف ڈاکٹر اور حضرت علامہ کے علاوہ حاضرین مجلس بھی خوب خوب حصّہ لیتے[3]"

غالباً ۲۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو علامہ اقبال لاہور واپس گئے۔

۱۹۳۴ء کے فروری کے وسط میں ڈاکٹر انصاری نے بہجت وہبی کو جو اُن کے رفیق درس رہ چکے تھے، جامعہ میں توسیعی خطبات کے لیے تیار کر لیا تھا اور جس کی صدارت کے

---

[1] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۲۷

[2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۹۸

[3] " " " " ص ۱۰۱

لیے انھوں نے علامہ سے درخواست کی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے کہنے پر نذیر نیازی صاحب نے بھی ڈاکٹر اقبال کو خط لکھا جس کے جواب میں علامہ نے تحریر کیا:

"۔۔۔۔ میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ہے اس لیے دہلی میں ڈاکٹر وہبی صاحب کے لکچر کی صدارت کے لیے نہیں جاسکوں گا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا تار بھی آیا تھا مگر میں نے جواب لکھ دیا کہ میں بوجہ علالت دہلی آنے سے معذور ہوں، ڈاکٹر ذاکر صاحب کا خط بھی اس مطلب کا آیا ہے، میں علاحدہ ان کو نہیں لکھ سکا۔[1]"

جنوری ۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم مشہور ترکی ادیبہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر دہلی تشریف لائیں تاکہ توسیعی خطبہ دیں۔ تو علامہ سے ایک خطبہ کی صدارت کے لیے ڈاکٹر انصاری نے پھر درخواست کی۔ علاّمہ نے معذوری ظاہر کی اور نذیر نیازی صاحب کو ۲۰ر جنوری ۱۹۳۵ء کو تحریر کیا:

"۔۔۔۔ ڈاکٹر انصاری کا خط آیا تھا وہ خالدہ ادیب خانم کے ایک لکچر میں صدارت کے لیے بلاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں اپنی آواز کی وجہ سے لاچار ہوں ورنہ حاضر ہوتا اور خالدہ ادیب خانم کے متعلق کوئی مختصر تقریر بھی کرتا۔[2]"

لیکن یہ ڈاکٹر انصاری کی شخصیت تھی کہ عین وقت پر علامہ اقبال دہلی آئے۔ قوفصل خانہ میں قیام کیا اور جلسہ کی صدارت کی۔ پھر ۱۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی امداد کے لیے ڈاکٹر انصاری نے اپیل کی تو علامہ اقبال نے ۲۵ر فروری ۱۹۳۵ء کو اس اپیل کی پُرزور تائید ان الفاظ میں کی:

"مجھے یہ سُن کر نہایت خوشی ہوئی کہ جامعہ ملیہ کی عمارت کا سنگ بنیاد نصب ہونے والا ہے میں اُن تعلیمی مجاہدوں سے جنھوں نے مسلمانوں کی

---

[1] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۱۲۶

[2] " " " " ص ۲۳۹

تعلیم کی اصلاح و ترقی کا علم بلند کیا ہے، ابتدا سے دلی ہمدردی رکھتا ہوں، چنانچہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۸ء میں جو اپیلیں جامعہ کی امداد کے لیے شائع ہوئی تھیں، اُن پر میں نے دستخط کیے تھے۔ پچھلے چند سال کے عرصے میں مجھے اکثر دہلی جانے کا اتفاق ہوا، اور میرے تعلقات اس درس گاہ سے اور بھی مستحکم ہو گئے۔ اس کے کارکنوں کے ایثار اور خلوص اور جوش عمل نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ مالی پریشانی اور بے سروسامانی کے باوجود ان لوگوں نے جو علمی اور تعلیمی خدمت انجام دی ہے اس سے اُمید ہوتی ہے کہ اگر انھیں معمولی مصارف کی طرف سے اطمینان ہو اور رہنے کے لیے مکان مل جائیں تو یہ حقیقت میں ہندستان کی تعلیمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیں گے اور مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دیں گے۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی اپیل کی پرزور تائید کرتا ہوں اور ہر مسلمان سے درخواست کرتا ہوں کہ جامعہ کی عمارت کے فنڈ میں حسب حیثیت مدد کر دیں۔"[1]

۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو علامہ اقبال نے نذیر نیازی صاحب کو اطلاع دی کہ ان کا علاج کے لیے وائنا جانے کا خیال ہے جس کے لیے ڈاکٹر انصاری نے بھی مدد کا وعدہ کیا ہے:

"آپ کے خط کا انتظار تھا۔ وائنا (آسٹریا) جانے کا خیال ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔ انھوں نے نہایت مہربانی سے مدد کا وعدہ کیا ہے اگر گیا تو فروری یا اپریل ۳۶ء میں جاؤں گا۔"[2]

پھر ۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ڈاکٹر عبدالباسط صاحب کو وائنا جانے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] گفتار اقبال از محمد رفیق افضل ص ۱۹۰۔

[2] مکتوبات اقبال از نذیر نیازی ص ۲۹۹

آپ کا والا نامہ کچھ دن ہوئے مل گیا تھا، جس کے لیے سپاس گزار ہوں، خدا کے فضل وکرم سے میری صحت اچھی ہے اور آواز میں بھی امپروومنٹ ہے۔ بلغم بھی اب بہت کم ہوگئی ہے۔ صبح کے وقت البتہ آتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر انصاری اور سیّد راس مسعود سے خط وکتابت کی ہے اور دونوں حضرات نے وائنا جانے کے خیال کی تائید کی ہے مگر جانے کے متعلق آخری فیصلہ کرنے سے پہلے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے ڈاکٹر مظفر علی صاحب کا پتا بھیج دیا ہے اور خود بھی ان کو خط لکھا ہے۔[1]"

اس طرح یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کا جو تعلق ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ابتدا میں پیدا ہوا تھا وہ باوجود بعض سیاسی اختلافات کے آخری زمانہ تک نہ صرف قائم رہا تھا بلکہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے علامہ اقبال جامعہ سے اور زیادہ قریب ہوگئے تھے، اس موضوع پر ابھی اور کام کرنے کی گنجایش ہے۔ اگر وہ خطوط جو علامہ نے ڈاکٹر انصاری کو لکھے ہیں اور ڈاکٹر انصاری نے علامہ کو لکھے ہیں مل جائیں۔ ابھی تک اس طرح کے بہت سے خطوط نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس لیے ہم کسی محقق کے منتظر ہیں کہ وہ ان خطوط کو منظر عام پر لاکر دونوں عظیم شخصیتوں کے تعلقات پر مزید روشنی ڈالے۔

(انصاری نمبر: آج کل دہلی: جنوری ۱۹۸۱ء)

---

[1] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۲۴۴

اقبال اور خواجہ حسن نظامی

انیسویں صدی کے آخری پچیس۲۵ سال اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ اس میں اردو کے عظیم نثر نگار اور شاعر پیدا ہوئے یا اُن کا بہت اہم تعلق اس دور سے رہا ہے، سرسیدؒ محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، داغ دہلوی وغیرہ ایسے ہی ادیب اور شاعر ہیں جو اس دور میں پیدا تو نہیں ہوئے لیکن اس دور کے اردو ادب پر ان کا گہرا اثر رہا ہے لیکن ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، منشی پریم چند، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، محمود شیرانی، سید علی بلگرامی وغیرہ ایسے حضرات کے نام ہیں جن کی پیدائش اسی ربع صدی میں ہوئی ہے۔ اور جنھوں نے اپنے فکر و خیال اور سعی پیہم سے اپنے دور کے ادبی و علمی خزانے میں نمایاں اضافہ بھی کیا ہے اور اپنی اپنی پہچان سے بھی آشنا کیا ہے۔ ان میں سرفہرست دو نام ایسے حضرات کے ہیں جو ایک دوسرے سے محض تعلق ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ایک دوسرے کو عزیز جانتے تھے، ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، ایک دوسرے کے لیے فکرمند رہتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات کی صرف خواہش ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ مواقع بھی تلاش کرتے تھے، میری مراد حضرت خواجہ حسن نظامی اور علامہ اقبال سے ہے۔ اقبال کی تاریخ پیدائش ۹/ نومبر ۱۸۷۷ء طے کی گئی ہے اور خواجہ حسن نظامی کی ولادت ۱۸۷۹ء میں ہوئی تھی، علامہ اقبال یوں تو خواجہ حسن نظامی سے تقریباً دو سال بڑے تھے لیکن دو سال کی بڑائی ادب کی دنیا میں کوئی فرق نہیں سمجھی جاتی۔ دونوں برابر تھے ایک دوسرے

کے دوست تھے، ایک دوسرے کے چاہنے والے تھے اپنے اپنے مزاج اور اندازِ فکر کی روشنی میں دونوں نے ادب کی بھی خدمت کی، مذہب کی بھی اور انسانیت کی بھی، ان میں خواجہ خالص نثر نگار تھے۔ عربی، فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے۔ باعمل صوفی باوقار خطیب، اچھے صحافی، صاحب طرز ادیب، انشائیہ نگار، تاریخ داں، اور سوانح نویس ہی نہیں تھے بلکہ سفرنامے اور روزنامچے قلمبند کرنے میں بھی نمایاں خوبیوں کے مالک تھے۔ نوک قلم سے صفحات پر چہروں کے نقوش اُبھارنے اور سچائی کی پہچان کرانے میں ماہر تھے۔ وہ عمیق فکر اور بلند نظر رکھنے کے علاوہ اور بہت سی خوبیوں اور خصوصیتوں کے مالک تھے۔ دوسری طرف علامہ اقبال، بلند مرتبہ شاعر، عالی مرتبت مفکر، رمز خودی سے آشنا، عارف یزداں، عاشقِ رسول، قدر دانِ خاک ہند، شیدائے انسانیت اور پیام برِ محبت تھے۔

دونوں حضرات میں کب سے تعلقات پیدا ہوئے اس پر اب تک کوئی تحقیقی روشنی نہیں ڈالی جاسکی ہے۔ مجھے تلاش وجستجو کے بعد اس حد تک علم ہوسکا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو دشمنوں نے فوجداری کے مقدمے میں ملوث کر لیا تھا تو علامہ اقبال بہت مضطرب ہوئے۔ اس پریشانی میں انھوں نے ایک نظم "برگِ گل" بر مزار حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی کہی اور اسے چھاپ کر حضرت خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں بھیج دیا جو عرس کے موقع پر پڑھی گئی تھی پہلا شعر یہ ہے:

ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے

جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے بھی اقبال اور خواجہ صاحب کے درمیان کوئی رسم وراہ تھی؟ یا اسی واقعہ کے بعد دونوں کے درمیان تعلق پیدا ہوا۔ اگر بھائی کے ساتھ فوجداری کا مقدمہ ہی خواجہ صاحب سے رشتہ پیدا کرنے کا باعث ہے تو اس بات کا امکان ہے کہ اس نظم کے ساتھ اقبال کا خط بھی ہوگا جو اب تک دستیاب نہیں ہوا ہے۔ ممکن ہے کہیں پڑا ہوا ہو، اس کے ملنے پر دونوں کے تعلقات پر مزید روشنی پڑے گی۔

خواجہ کے نام پہلا دستیاب خط ۲۲ جولائی ۱۹۰۴ء کا ہے جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دونوں حضرات کے درمیان اس وقت تک کے تعلقات نہایت پرخلوص تھے ملاحظہ کیجیے :

"دو دفعہ میں نے اخبار میں وہ خبر پڑھی جسے پڑھ کر لاہور کے تمام دوستوں کو بے انتہا تشویش تھی۔ مگر قدرت خدا کی مجھے مطلق رنج نہ ہوا اور اسی بنا پر جس دوست نے مجھ سے پوچھا میں نے بے تکلف کہہ دیا کہ خبر غلط ہے۔ الحمد للہ کہ ایسا ہی ثابت ہوا اور میں لاہور کے احباب میں مفت کا صوفی مشہور ہوگیا، ایسی خبریں زیادتیِ غم کی علامت ہیں۔ میری نسبت بھی لاہور میں اسی قسم کی خبریں مشہور ہوگئی تھیں۔"

اسی خط میں پھر آگے تحریر ہے :

اس خبر سے کم از کم یہ تو معلوم ہوگیا کہ ملک کو آپ کی کس قدر ضرورت ہے انشاء اللہ میں بھی تعطیلوں میں اگر ممکن ہوا تو آپ سے دہلی میں ملوں گا [1]

معلوم نہیں علامہ اقبال دہلی جاسکے یا نہیں اگر دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی تو کیا یہ پہلی ملاقات ہوئی یا اس سے پہلے ملاقات ہوچکی تھی۔ محققین ابھی تک اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ ملا واحدی صاحب کے مضمون "خواجہ حسن نظامی" مطبوعہ شخصیات نمبر نقوش لاہور جنوری ۱۹۵۵ء سے ۱۹۰۴ کے ایک واقعہ کا علم ہوتا ہے جس سے دونوں کے درمیان اچھے رشتہ کا پتا چلتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں :

"علی حسن نظامی کو مختصر خواجہ صاحب نے ۱۹۰۴ء ہی میں کیا اور ۱۹۰۴ء ہی میں "خواجہ" صاحب کا لفظ حسن نظامی کے ساتھ علامہ اقبال نے لگایا جو اس وقت پروفیسر شیخ محمد اقبال

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۲

سے تھے[1]

جب ۱۹۰۵ء میں خواجہ صاحب نے پنجاب کا سفر کیا تو ان کی ملاقات علامہ سے ہوئی ہوگی لیکن اس بات کے لیے کوئی ثبوت پیش کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ البتہ جب ۱ر ستمبر ۱۹۰۵ء کو علامہ لاہور سے یورپ اعلا تعلیم حاصل کرنے کو روانہ ہوئے تو دہلی میں قیام کیا، خواجہ صاحب سے ملاقات بھی ہوئی اور حضرت شیخ نظام الدین محبوبؒ الٰہی کے مزار پر حاضری بھی دی۔ تفصیل کے لیے مکتوب اقبال بنام انشاء اللہ خاں از عدن مورخہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۰۵ء ملاحظہ کیجیے:

"آپ سے رخصت ہوکر اسلامی شان و شوکت کے اس قبرستان میں پہنچا جس کو دہلی کہتے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر خواجہ سید حسن نظامی اور شیخ نذر محمد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس موجود تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے شیخ صاحب موصوف کے مکان پر قیام کیا بعد ازاں حضرت محبوب الٰہی کے مزار پر حاضر ہوا اور تمام دن وہیں بسر کی۔

اللہ اللہ حضرت محبوب الٰہی کا مزار بھی عجیب جگہ ہے بس یہ سمجھ لیجیے کہ دہلی کی پرانی سوسائٹی حضرت کے قدموں میں مدفون ہے۔ خواجہ حسن نظامی کیسے خوش قسمت ہیں کہ ایسی خاموش اور عبرت انگیز جگہ میں قیام رکھتے ہیں۔ شام کے قریب ہم اس قبرستان سے رخصت ہونے کو تھے کہ میر نیرنگ نے خواجہ صاحب سے کہا کہ ذرا غالب مرحوم کے مزار کی زیارت بھی ہو جائے کہ شاعروں کا حج یہی ہوتا ہے، خواجہ صاحب موصوف ہم کو قبرستان کے ایک ویران سے گوشے میں لے گئے جہاں وہ گنجِ معانی مدفون ہے جس پر دہلی کی خاک ہمیشہ ناز کرے گی۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے ساتھ ایک نہایت خوش آواز لڑکا تھا ولایت نام تھا، اس ظالم نے مرزا کے مزار پر بیٹھ کر:

"دل سے تیری نگاہ، جگر تک اُتر گئی"

---

[1] خواجہ حسن نظامی نقوش شخصیات نمبر ا ص ۲۵۶

کچھ ایسی خوش الحانی سے گائی کہ سب کی طبیعتیں متاثر ہوگئیں، بالخصوص جب اس نے یہ شعر پڑھا:

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ آنکھیں پرُنم ہوگئیں اور بے اختیار لوحِ مزار کو بوسہ دے کر اس حسرت کدہ سے رخصت ہوا۔ یہ سماں اب تک ذہن میں ہے اور جب کبھی یاد آتا ہے تو دل کو تڑپا جاتا ہے۔

اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامن دل کو کھینچتے ہیں مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے پر فاتحہ پڑھا۔ دارا شکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ھُوَالموجود کی آواز سنی اور دہلی کی عبرت ناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رخصت ہوا جو صفحۂ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔[1]

اقبال نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے مزارِ مبارک کے سرھانے بیٹھ کر اپنی نظم "التجائے مسافر" پڑھی لیکن میر غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں:

"درگاہ میں پہنچ کر مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے، اوّل اقبال نے عالم تنہائی میں مزار مبارک کے سرھانے بیٹھ کر ذیل کی نظم پڑھی اور ان کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزار مبارک کی طرف منہ کر کے دوبارہ ایک نہایت درد انگیز اور دلنشیں لہجہ میں پڑھا۔ سب احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہوئے اور بے تحاشا زبان سے موقع بہ موقع کلمات تحسین و آفریں و آمین نکلتے تھے۔ ایک محویت کا عالم تھا کہ جس کی تصویر کشی حاضرین کے تصور

---

[1] خطوط اقبال از رفیع الدین ہاشمی ص ۷۹

[2] نظم ملاحظہ کیجیے۔ فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا اقبال اور دلی از عبدالقوی دسنوی ص ۲۶

ہی کر سکتے ہیں۔ درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی کے مکان پر قیام کیا اور حضرت محبوب الٰہی کے لنگر کی مہمانی سے بہرہ اندوز ہوئے۔ ولایت نامی ایک نوعمر قوّال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ نوتعلیم تھا مگر خوش گلو اور باطبیعت۔ وہ کچھ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے اور کیفیت سے گزرا۔[1]

کیمبرج پہنچ کر اقبال نے "اسرار قدیم خواجہ حسن نظامی" کو دو خط لکھے پہلا خط دستیاب نہیں ہے دوسرا مکتوب مورخہ ۸/ اکتوبر ۱۹۰۵ء کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ وہاں مسئلہ قرآن و تصوف کو سمجھنے کی فکر میں پریشان تھے اور اس سلسلے میں وہ خواجہ صاحب کی مدد چاہتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں:

"..... اب ایک اور تکلیف دیتا ہوں اور وہ یہ کہ قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوّف کے متعلق ہوں ان کا پتا دیجیے۔ سپارہ اور رکوع کا پتا لکھیے اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصّل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔[2]"

یہ خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اقبال جو کچھ تصوّف سے متعلق رائے قائم کرنے جا رہے تھے اس کی ابتدا اسی وقت اس طرح ہو گئی تھی جس میں خود خواجہ صاحب کا حصہ تھا۔ اسی خط میں وہ آگے لکھتے ہیں:

"اگر قاری صاحب (قاری شاہ سلیمان) کو یہ ثابت کرنا ہے کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوّف کا اصل قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔؟ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے

---

[1] مخزن اکتوبر ۱۹۰۵ء خطوط اقبال ص ۳۰۱

[2] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۵۳

تعلق ہے[1]

تقریباً ۲ ½ سال کے بعد لندن سے ۱۰ر فروری ۱۹۰۸ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "اسلامی مذہب وتمدن" پر انھوں نے لکچروں کا سلسلہ شروع کیا تھا جس میں "اسلامی تصوّف" پر بھی ایک لکچر تھا، لکھتے ہیں:

"..... انگلستان میں، میں نے اسلامی مذہب و تمدّن پر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لکچر ہو چکا ہے دوسرا "اسلامی تصوف" پر فروری کے تیسرے ہفتہ میں ہوگا۔ باقی لکچروں کے معانی یہ ہوں گے "مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر"۔ "اسلامی جمہوریت"۔ "اسلام اور عقل انسانی" وغیرہ[2]"

علاّمہ اقبال کے خواجہ حسن نظامی کے نام لندن سے کل چار خط ملتے ہیں جو اقبال نامہ حصہ دوم میں محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے اس بات کا صاف اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان بے تکلّفی کی حد تک تعلقات تھے۔ اس دوران میں لکھے گئے خطوط کے بعض اقتباسات ملاحظہ کیجیے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پراسرار نظامی! کارڈ ابھی ملا۔ اس سے پہلے آپ کا نوازش نامہ نہیں ملا ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کا خط آئے اور میں جواب نہ دوں[3]"

آگے اسی خط میں لکھتے ہیں:

"..... کیوں صاحب آپ مجھے رُسوا کر کے اب مشہور کرنے لگے۔"

اب مری شہرت کی سوجھی ہے انھیں دیکھے کوئی
مٹ کے میں جس دم غبارِ کوے رسوائی ہوا[4]

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتب شیخ عطاء اللہ ص ۲۵۰

[2] " " " " ص ۲۵۷

[3] " " " " ص ۲۵۵

[4] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۵۵

۲۵ر اپریل ۱۹۰۶ء کے مکتوب کی شگفتگی ملاحظہ کیجیے:

"سرمست سیّاح کو سلام، متھرا، ہردوار، جگن ناتھ، امرناتھ جی سب کی سیر کی۔ مبارک ہو۔ مگر بنارس جاکر لیلام ہوگئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔ بلکہ ہمارے میر صاحب نیرنگ اور اکرام کو بھی ساتھ لے ڈوبے۔ میرے پہلو میں ایک چھوٹا سا بُت خانہ ہے کہ ہر بُت اس صنم کدے کا رشکِ صنعت آذری ہے۔ اس پُرانے مکان کی کبھی سیر کی ہے۔ خدا کی قسم بنارس کا بازار فراموش کر جاؤ۔ میں تو ہر قدم پر آپ کو یاد آیا تھا۔ کیوں نہ یاد آؤں۔ آپ بھی ہم کو یہاں عموماً یاد آیا کرتے ہیں[1]۔"

۱۰ر فروری ۱۹۰۸ء کے خط میں اقبال اپنے اور خواجہ صاحب کے گہرے تعلقات کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں:

"..... میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں راستی پر ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ دیکھنے کو دو۔ حقیقت میں ایک[2]۔"

خطوط کے ان اقتباسات کا ہر لفظ دو مخلص دوستوں کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سنا رہا ہے۔ ان کے مطالعے سے یقین ہو جاتا ہے کہ خواجہ کا شمار اقبال کے بہت قریب، عزیز اور بے تکلّف دوستوں میں ہوتا تھا۔

علامہ اقبال تقریباً تین برس یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب ہندستان واپس آئے تو سب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیا کے آستانۂ مبارک پر پہنچے اور حضرت خواجہ حسن نظامی کے ایک دن مہمان رہے۔ غلام بھیک نیرنگ کے علاوہ چند احباب وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اس بزم بے تکلف و پُرمسرت میں نیرنگ نے اقبال کی آمد کی خوشی میں ایک تازہ نظم کہی تھی انھوں نے وہ نظم سنائی۔ جس کا پہلا شعر تھا۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۶

[2] " " " ص ۳۵۸

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں
اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں

لاہور پہنچنے کے بعد علامہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے درمیان نہایت محبت اور خلوص کا رشتہ قائم رہا جس کا اظہار خطوط کے ذریعہ ہوتا رہا۔ ان خطوط کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال خواجہ صاحب سے روز بروز قریب تر ہوتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور عقیدت نے اس رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ خطوط کے اقتباسات ہی سے دونوں کے درمیان تعلق کی نوعیت اور حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کے خط کے کچھ حصّے یہ ہیں:

"..... یہ نیاز جو آپ کو پہنچی ہے والدۂ مکرمہ کی نیاز تھی قبول فرمائیے.." [1]

"..... آپ لوگوں کو میرا مشتاق بناتے ہیں، مجھے کچھ اعتراض نہیں، مگر اندیشہ ہے کہ مجھ سے مل کر انھیں مایوسی ہوگی..." [2]

"آپ اپنی ہر تحریر میں بغیر پوچھے مجھے شریک تصوّر کیجیے۔ مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بے تاب کر رکھا ہے جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا، جو مجھے تنہائی میں رُلاتا ہے اس کی وجہ مجھ سے پہلے سن لیجیے پھر جو چاہیے کیجیے میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ میرے ساتھ۔"

نومبر ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں خواجہ کو لاہور کی دعوت دیتے ہیں اور اُن پر اخباروں میں کیے گئے حملے پر اظہار افسوس کرتے ہیں:

..... کئی دنوں کی بیماری کے بعد کل بستر بیماری سے اُٹھا ہوں مفصّل خط پھر لکھوں گا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو لاہور آنے کی تکلیف دوں گا آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں، بعض لوگ آپ پر اخباروں میں

---

[1] اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۶۰
[2] " " " ص ۳۶۰

حملے کرتے ہیں افسوس ہے مسلمانوں میں معمولی اخلاق بھی نہ رہے۔
میں خود علی گڑھ کالج کی پروفیسری نامنظور کرنے سے ہدف ملامت ہو رہا ہوں مگر ؎

شادم زطعنِ خلق کہ مرغانِ باغ عشق
شاخے کہ سنگ می رسدش آشیاں کنند[1]

۲۵ر نومبر ۱۹۰۸ کا اقبال کا خط بھی اہم ہے۔ اس میں حلقۂ نظام المشائخ کے قائم ہونے پر اقبال نے مسرت کا اظہار کیا ہے اور اس حلقہ سے اپنے کو متعلق بتاتے ہیں اس خط سے اقبال کی اس خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے کہ وہ خواجہ کو لاہور بلانا چاہتے تھے ذرا اقبال کی تحریر پر نظر ڈالیے :

"آپ کے حلقے کا ذکر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے بھی اس حلقے میں شامل تصور کیجیے اور اہل حلقہ سے استدعا کیجیے کہ میرے حق میں دعا کریں۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری امر میں مشورہ کرنا ہے اور اس میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ تا حال فارغ البالی سے بیٹھنے کا موقع نہ ہوا ورنہ عرض کرتا۔ بہرحال آپ ایک نئی بات سننے کے لیے تیار رہیں۔ میرے خیال میں اور احباب بھی ہیں جن سے ابھی تک ذکر اس بات کا نہیں آیا۔ تاہم وہ اس امر میں یقین ہے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں ابھی آپ کو دہلی سے لاہور تشریف لانے کی خبر دیتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نادانستہ اسی طرف کو جا رہے ہیں جس طرف میں آپ کو لانا چاہتا ہوں۔ اس بات نے مجھے جرأت دلائی ہے کہ آپ سے اپنے سینے کا دُکھ ظاہر کروں۔ بہت کم لوگ ہیں جو بہت ہمدردی کے ساتھ اس قضیے کو سُن سکتے ہیں، مگر آپ سے مجھے پوری ہمدردی کی توقع ہے ابھی تک کسی دوست سے اس بات کا ذکر نہیں آیا۔ آپ سے ذکر ہو چکنے کے بعد اگر مناسب ہوا تو بعض

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۵۹

خاص دوستوں سے اس کا تذکرہ کروں گا۔[1]"

پورا خط خواجہ سے گہرے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے دوستوں میں سب سے زیادہ قربت خواجہ حسن نظامی صاحب کو تھی جن کی دلی ہمدردی پر اقبال کو اعتماد تھا۔ بعض مسائل میں اقبال نے خواجہ صاحب سے مشورے بھی کیے ہیں اس سے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ انھیں حلقۂ نظام المشائخ سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۹۰۹ء کے خط میں بھی وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ مجھ کو بھی اپنے حلقۂ مشائخ کے ادنا ملازمین میں تصور کیجیے۔[2]"

اسی زمانے میں یعنی ۱۹۰۹ء (جمادی الآخر ۱۳۲۶ھ) سے خواجہ صاحب نے ایک رسالہ نظام المشائخ جاری کیا تو علامہ اقبال کی غزلیں، نظمیں مسلسل اس میں چھپنا شروع ہوئیں۔ علامہ کی مشہور نظم غالباً "شکوہ" پہلی بار اسی میں شائع ہوئی تھی۔

اقبال کا ۲/ اگست ۱۹۰۹ء کا خط دوستانہ خلوص اور بے تکلفی کا مظہر ہے لکھتے ہیں:

"مخدومی! رسالہ پہنچ گیا تھا، آپ کی دست بستہ دعا نے بڑا لطف دیا۔ میں فراموش کار نہیں البتہ اگر آپ کو یہ لقب دیا جائے تو موزوں تر ہے[3]"

اسی خط میں آگے رقمطراز ہیں:

"پنجاب میں نظامی مشہور ہوں اور آپ میری خبر نہیں لیتے۔"

گویا تعلقات اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ اقبال نظامی سمجھے جاتے تھے۔ گہرے تعلقات کی معراج اسی کو تو کہتے ہیں۔

۶/ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے خط بنام اکبر الہ آبادی میں خواجہ حسن نظامی سے محبت کا اظہار اقبال اپنے اس جملے سے کرتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی واپس تشریف لے آئے، مجھے بھی ان سے محبت

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۶۲

[2] " " " ۳۶۳

[3] " " " ۳۹۴

ہے اور ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں [1]"

۲۴ رجون ۱۹۱۲ء کے خط میں خواجہ صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں:

"۱۲ روپے جس طرح آپ کے خیال میں آئے خرچ کر دیجیے، حلوہ پکا دیجیے یا خانقاہ کے متعلقین میں خرچ کر دیجیے۔

آپ سے ملنے کو دل چاہتا ہے مگر کیا کروں علائق نہیں چھوڑتے [2]"

اقبال کا مندرجہ ذیل خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں خواجہ صاحب سے دوستی کا دم بھی بھرا گیا ہے، ان کی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور اپنی خدمات کے اظہار کے ساتھ دوست سے بے توجہی کی شکایت بھی۔ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے اقبال نامہ حصہ دوم میں یہ ۲۴ رجون ۱۹۱۲ء کے خط کے بعد شائع کیا گیا ہے لیکن روح مکاتیب اقبال میں محمد عبداللہ قریشی نے اسے آخر دسمبر ۱۹۱۱ء میں جگہ دی ہے دیکھیے اقبال کس طرح دوستانہ شکایت کرتے ہیں:

"خدا آپ کا بھلا کرے، آپ نے ہندستان کے پرانے بت کدے میں توحید کی مشعل روشن کی۔ مجھے یقین ہے کہ دل اس کی حدت سے گرمائیں گے اور آنکھیں اس کے نور سے منور ہوں گی۔ میں بھی اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ حاضر کروں گا۔

مسلمانان ہندستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپ نے اس ہفتہ کی توحید میں ارقام فرمائے ہیں بالکل بجا ہیں لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اس وقت منکشف کیا جب ہندستان والے اس سے غافل تھے۔ اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، بلقان، طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے کس کا خوشہ چیں ہے؛ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کام برا بھلا جو کچھ بھی ہو غیر محسوس ہوتا ہے اور ظاہر بیں آنکھیں مرئیات کی

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم شیخ عطاء اللہ ص ۳۶

[2] " " " " ص ۳۶۴

طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔

اس خط کا مقصد شکایت نہیں اور نہ یہ کہ اقبال کے کام کا اشتہار ہو۔ حسن نظامی کو خوب معلوم ہے کہ اس کا دوست اشتہار پسند مزاج لے کر لے کر دنیا میں نہیں آیا۔ مگر یہ مقصد اس خط کا ضرور ہے کہ ایک واقف حال دوست کی غلط فہمی دور ہو، تاکہ اقبال کی وقعت اپنے دوست کی نگاہ میں محض اس خیال سے کم نہ ہو کہ اس نے مسلمانانِ ہند کی بیداری میں حصہ نہیں لیا[1]"

یہ خط اس لحاظ سے اہم ہے کہ علامہ نے جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کبھی اپنے متعلق اس طرح کی شکایت نہیں کی ہے، اس خط سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خواجہ کو کس قدر اپنا محسوس کرتے تھے۔ یہ اپنائیت ہی کا جذبہ تھا جو شکایت کر بیٹھے۔

ہفت روزہ "توحید" کا خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں ۸ رجون ۱۹۱۳ء کو "خواجہ نمبر" شائع ہوا تھا جس میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے اعلان کیا تھا:

"اس میں شائع ہونے والی بہترین نظم، غزل اور مضمون پر اوّل، دوم اور سوم انعامات تمغوں کی صورت میں دیے جائیں گے[2]"

اور مُنصف کی حیثیت سے خواجہ صاحب نے علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی اور عبدالحلیم شرر صاحبان کو منتخب کیا تھا چنانچہ علامہ اقبال نے اس ذمہ داری کو خوشی سے قبول کیا اور نتیجہ سے خواجہ صاحب کو اس طرح آگاہ کیا:

ڈیر خواجہ صاحب السلام علیکم

"خواجہ نمبر" میں نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کالج کا مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند آیا کہ معنی خیز ہے، اس سے دوسرے نمبر پر "زلف خواجہ کا اسیر" اور "شہنشاہوں کی پیشانیاں اجمیری چوکھٹ پر" موخر الذکر

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم شیخ عطاء اللہ ص ۳۶۷

[2] اوراق گم گشتہ مرتب رحیم بخش شاہین

مضمون کچھ نتیجہ خیز نہیں ہے۔

نظموں میں گرامی صاحب کی غزل سب سے اعلا اس کے بعد شفق صاحب کا ترانہ یا یوں کہیے کہ فارسی نظموں میں گرامی صاحب کی غزل اوّل نمبر اور اردو نظموں میں شفق صاحب کا ترانہ [1]۔"

۷ر جولائی ۱۹۱۱ء کے خط بنام عطیہ بیگم میں مثنوی "اسرارِ خودی" کے چند اشعار ملتے ہیں اس سے پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے ۱۹۱۱ء کے وسط ہی سے مثنوی لکھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ مثنوی کے سلسلے میں وہ عطیہ فیضی کو اطلاع دیتے ہیں:

" والد نے مجھ سے فرمایش کی ہے کہ میں بو علی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر فارسی میں کوئی مثنوی لکھوں اور اس اہم کام کی مشکلات کے باوجود میں نے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا ہے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن — بزم را از ہاؤ ہو آباد کُن
آتش استی بزم عالم بر فروز — دیگراں را ہم ز آتش بسوز
سینہ را سر منزل صد نالہ ساز — اشکِ خونیں را جگر پر کالہ ساز

پشت پا بر شورش دنیا بزن
موجہ بیرونِ ایں دریا بزن [2]

یہ بات دلچسپ ہے کہ مثنوی کی اشاعت سے بہت پہلے اس کے (۲۷) اشعار حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی مندرجہ تحریر کے ساتھ یکم اگست ۱۹۱۲ء کے ہفت روزہ "توحید" میرٹھ میں شائع ہوئے تھے:

یہ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شہرۂ آفاق اور ہر دلعزیز شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا روم ارشاد فرماتے ہیں، اقبال مثنوی لکھو، عرض کیا مثنوی کا حق تو آپ ادا کر گئے۔ فرمایا نہیں تم بھی لکھو۔ التماس کی آپ فرماتے ہیں خودی کو

---

[1] ہفت روزہ توحید میرٹھ ۲۴ر جولائی ۱۹۱۲ء بحوالہ اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہیں ص ۱۲

[2] اقبال از عطیہ بیگم ترجمہ ضیاء الدین احمد برنی ص ۷۶ بحوالہ اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہیں ص ۲۰

مٹاؤ اور مجھ کو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خودی قائم کرنے کی چیز ہے ارشاد ہوا نہیں ہمارا مطلب بھی یہی ہے جو تم سمجھتے ہو۔ آنکھ کھولی تو زبان پر یہ شعر تھے۔ جن کو قلمبند کرنا شروع کیا۔ پہلی قسط اخبار توحید کے ذریعہ شائع کی جاتی ہے۔ جس میں کچھ حصہ نعت کا ہے اور کچھ متفرق اشعار قیام خودی کی نسبت ہیں۔ ناظرین نظر غور سے پڑھیں۔ نوکری کی نسبت جو کچھ جناب اقبال کے قلم سے نکلا ہے وہ اس قابل ہے کہ دور حاضر کے وہ تمام نوکری پرست لوگ جو دوسروں کی غلامی کے لیے باہمی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہم غلام نہیں بنیں گے۔ مسلمان کہتے ہیں یہ حلقہ ہمارے کان میں ڈالنا چاہیے ایسے دار و گیر کے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ہندستانیوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ناظرین توحید اس نظم کو خود بھی یاد کریں اور اپنے دوستوں کو بھی یاد کروائیں[1]"

ابتدائی ۱۹۱۳ء ہی کی بات ہے جب علامہ "اسرار خودی" کی تصنیف میں لگے ہوئے تھے ایک دن محمد دین فوق نے ان سے اسلامی تصوّرات سے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ علامہ نے جو کچھ جواب دیا فوق صاحب نے انھیں مضمون کی صورت میں "مسلمانوں کا امتحان" کے عنوان سے اپنے ہفتہ وار اخبار کشمیری کے ۴ر جنوری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں شائع کر دیا جس میں اسلامی تصوّف سے متعلق علامہ اقبال کے یہ خیالات تھے:

"۔۔۔۔ غرض ارکان اسلام کی پابندی مسلمانوں کا ایک عظیم امتحان ہے اور دراصل اسی کا نام اسلامی تصوّف ہے کیونکہ شعائر اسلام کی پابندی سے روح کو وہ تدریجی تربیت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے تبتیل الی اللہ کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے[2]"

---

[1] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۱۵

[2] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۲۷۹

۶/فروری ۱۹۱۵ء کے مکتوب بنام خواجہ حسن نظامی میں علامہ اپنی مثنوی کی اشاعت کے متعلق اطلاع دیتے ہیں اور اس کے لیے نام دریافت فرماتے ہیں:

"ڈیر خواجہ صاحب! آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث کی ہے اب قریبًا تیار ہے اور پریس جانے کو ہے اس کے لیے بھی کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کے نام اسرار حیات، پیام سروش، پیام نو، آئین نو تجویز کیے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجیے تاکہ میں انتخاب کر سکوں[1]"

اس بات کا پتا تو نہیں چل سکا ہے کہ خواجہ صاحب نے کیا نام تجویز کیا یا "اسرار خودی" کس نے تجویز کیا۔ لیکن ۲۲/جون ۱۹۱۵ء کے مکتوب بنام شاکر صدیقی سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مثنوی "اسرار خودی" کی کتابت ہو چکی تھی اور طباعت کے لیے پریس بھیجی جانے والی تھی اقبال لکھتے ہیں:

"..... افسوس ہے کہ دیوان ابھی تک شائع نہیں ہو سکا اس کی وجہ کچھ میری عدیم الفرصتی اور کچھ یہ کہ فارسی مثنوی موسوم بہ "اسرار خودی" مکمل ہو کر پریس کے لیے بھیجی جا چکی ہے۔ چند دنوں میں شائع ہو جائے گی ..... یہ مثنوی ایک نہایت مشکل کام تھا الحمد للہ باوجود مشاغل دیگر میں اس کام کو انجام تک پہنچا سکا[2]"

غالبًا ۱۹۱۵ء کے آخری چوتھائی حصے میں مثنوی "اسرار خودی" شائع ہوئی تو اس کی مخالفت اور موافقت میں آوازیں بلند ہوئیں، خاص طور سے اہل تصوف علامہ سے بہت ناراض تھے ان کا کہنا تھا کہ علامہ نے حکیم افلاطون یونانی اور خواجہ حافظ شیرازی کو اپنی مثنوی میں بُزو گو سفند کہہ کر ان بزرگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے خاص طور سے

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۶۸

[2] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۱۱۰

خواجہ حافظ شیرازی کے خلاف اقبال کے خیالات سے ان میں برہمی پیدا ہوگئی تھی۔ مثنوی "اسرار خودی" کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے، افلاطون کے متعلق لکھا تھا:

راہبِ اوّل فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم
گوسفندے در لباسِ آدم است — حکم او بر جان صوفی محکم است
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جان او وا رفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت — خالقِ اعیان نامشہود گشت
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطعِ شاخِ سرو، رعنائے حیات

اور حافظ کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
نیست غیر از بادہ در بازارِ اُو — از دو جام آشفتہ شد دستارِ اُو
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش در ہم منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملّتِ میخوار گاں — آں امامِ ملّتِ بیچارگاں
گوسفند است و نوا آموختہ است — فتنہ و ناز و ادا آموختہ است
دلربائی ہائے او زہر است و بس — چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس
از بُنِ یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ حورش حجابِ اکبر است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش
محفلِ او در خورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظ گزر — الحذر از گوسفنداں الحذر

(اقبال۔ جامعہ کے مصنفین کی نظر میں ص ۴۴)

دراصل اقبال نے اس مثنوی میں افلاطون کے عجمی تصوف[1] اور خواجہ حافظ شیرازی[2]

---

[1] ۱۱ جون ۱۹۱۸ء مکتوب بنام اکبر الہ آبادی اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۳
پہلے بیان کر چکا ہوں . . . . .

[2] ۱۱ جون ۱۹۱۸ء مکتوب بنام اکبر الہ آبادی اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۳
. . . . میں نے خواجہ حافظ پر کہی۔

کے فراری رجحان کے خلاف آواز بلند کی تھی وہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہی عجمی تصوف علانصب العین سے محروم شاعری کو سمجھتے تھے۔

اسی زمانے میں جب اقبال کے تصوف سے متعلق خیالات کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں ضیاء الدین برنی تصوف سے متعلق اپنا مضمون علامہ اقبال کو دکھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۲۰/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو اقبال انھیں اس سلسلے میں جواب دیتے ہیں جس میں خواجہ حسن نظامی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تصوف کی کتاب پر نظر ثانی کرنے کے لیے میں کسی طرح اہل نہیں کیونکہ مجھے تصوف سے معمولی واقفیت ہے اور وہ بھی سطحی۔ اس کام کے لیے موزوں تر آدمی خواجہ حسن نظامی ہیں[1]"

اس مثنوی کی مخالفت میں کئی حضرات آگے بڑھے انھیں میں حضرت خواجہ حسن نظامی بھی تھے۔ وکیل (امرتسر) خطیب (میرٹھ) اور زمیندار (لاہور) میں اس مثنوی کے سلسلے میں مضامین شائع ہوئے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے مضامین لکھے اور خواجہ حسن نظامی، اکبر الہ آبادی اور دوسروں کو خطوط تحریر کیے۔

غالباً خواجہ صاحب نے اپنی ناراضگی کا اظہار اپنے خط بنام ڈاکٹر اقبال میں بھی کیا جس کا جواب علامہ اقبال نے لاہور سے ۳۰/دسمبر ۱۹۱۵ء کو دیا۔ یہ خط بہت طویل ہے اس کے بعض حصے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ اقبال کے اندازِ فکر کو سمجھا جا سکے، ملاحظہ کیجیے:

"آپ کا والا نامہ مل گیا۔ آپ کی علالت کا حال معلوم کر کے تردد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ صحت عاجلہ عطا فرمائے۔

مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے عشق ہے۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقت اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے میرا فطری

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۴۳

اور آبائی میلان تصوّف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہوگیا تھا کیوں کہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے مگر قرآن پر تدبّر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔

"رہبانیت اور اسلام پر مضمون ضرور لکھوں گا مگر آپ کے مضمون کے بعد۔ رہبانیت، عیسائی مذہب کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر قوم میں پیدا ہوئی ہے اور ہر جگہ اس نے شریعت و قانون کا مقابلہ کیا ہے اور اس کے اثر کو کم کرنا چاہا ہے اسلام حقیقت میں اسی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا (اور تصوّف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے) اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔۔

"اب تک جو اعتراضات آپ کی طرف سے ہوئے ہیں وہ مثنوی کے دیباچے پر ہیں، نہ خود مثنوی پر۔ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ مثنوی پر کیا اعتراضات ہیں اس وقت تک میں کیوں کر قلم اٹھا سکتا ہوں۔ مثنوی پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وہ اس قدر ہے کہ حافظ کی بے حرمتی کی گئی ہے لیکن جب تک اصولی بحث نہ ہو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں حافظ کی تنقید میں کہاں تک حق بہ جانب ہوں۔"[1]

غالباً اسی خط کو بنیاد بنا کر خواجہ نے آٹھ سوال تیار کیے تھے اور مختلف اہل تصوّف کی خدمت میں بھیجے تھے۔

---

[1] اوراق پارینہ مرتبہ رحیم بخش شاہین، ص ۲۷۔ ۷، خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۱۴

اکبرالہ آبادی کے پاس جب اس سلسلے میں خط آیا تو انھوں نے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو خواجہ صاحب کو تحریر کیا :

"حضرت اقبال کے خطوط آئے میں نے جواب بھی لکھے۔ زمانہ مابعد معلوم نہیں کیا فتوے دے افلاطون بیوقوف بنے۔ حافظ شیراز دھریلے گئے تو ہم آپ کس گنتی میں ہیں[1]"

۳۰ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کے بعد اکبرالہ آبادی کا خط بنام خواجہ حسن نظامی یکم جنوری ۱۹۱۶ء کا لکھا ہوا ملتا ہے، جس میں اقبال سے متعلق افسوس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی مضمون لکھوں گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے زوال اقبال سے مجھ کو بہت ہی ملال ہوا ہے۔ اس باب میں پھر لکھوں گا۔ میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کو کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں صرف کریں۔ واحد صاحب کو میں نے ایک مطلع لکھ بھیجا ہے۔

سخن میں یوں تو بہت موقع تکلّف ہے
خودی، خدا سے جھکے بس یہی تصوّف ہے[2]

اکبرالہ آبادی ۲۱ر جنوری ۱۹۱۶ء کو خواجہ صاحب کو پھر لکھتے ہیں جس میں اقبال کی غلطی کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں :

"حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہوگا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلہ وحدت الوجود اور مسئلہ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ میں آپ کو مناسب و محفوظ جگہ پر نہ پاؤں گا اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لیے قلم اٹھائیں گے۔ علمائے شریعت نے غالباً فرمادیا ہے کہ یہ مسئلہ جزو اسلام نہیں ہے اور میں تو کہتا ہوں کہ ہمہ اوست کہنے سے

---

[1] اکبر و اقبال ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۱۱۵

[2] " " " " ص ۱۱۶

پہلے "او" کو ثابت کرو پھر "ہست" کی توضیح کرو۔ یعنی ہست کیا چیز ہے اور کسے کہتے ہیں۔ ہمہ اوست تک پہنچنے نہ پاؤ گے کہ حواس تشریف لے جائیں گے۔ حضرت اقبال خودی کو بڑھا کر ہمہ منم کہہ دیں تو مطلب حاصل ہے۔ شیخ سعدی کی نظم کیوں نہ پڑھ دیجیے بوستان میں ڈھونڈ لیجیے:

چو سلطان عزت علم بر کشد — جہاں سر بہ جیب عدم در کشد
رہ عقل جز پیچ بر پیچ نیست — بہر عارفاں جز خدا ہیچ نیست

آپ کو عذر نہ ہو تو ہم کو عذر نہیں کہ یہ شائع ہوں۔ ثقافت نہیں ہے:

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی اُن میں اِن میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لیے — آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لیے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی
ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص[1]

۲۵/جنوری کو مرزا سلطان صاحب کو اکبر لکھتے ہیں جس میں خواجہ صاحب کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"خواجہ حسن نظامی صاحب کو میں نے بار بار یہی لکھا کہ حضرت اقبال کی مثنوی کی مخالفت پر قلم نہ اٹھائیں۔ حضرت اقبال کو بھی میں نے نہ چاہا بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا ذرّہ اٹھائیں بہ عوض اس کے کہ ہم رندانِ بے سامان کے ساقی بنے رہیں، ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں ہم کو ان سے محبت ہے۔ آنچہ بخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند پر عمل کرتا ہوں[2]"

۲۷/جنوری ۱۹۱۶ء کو اکبر الہ آبادی کی خدمت میں تصوف سے متعلق اختلاف کرتے ہوئے اقبال شکایت کرتے ہیں:

انشاء اللہ اختلاف رائے کا اثر پرائویٹ تعلقات پر نہیں ہوگا میں نے صرف

---

[1] اکبر و اقبال از غلام حسین ذوالفقار ص ۱۱۷
[2] " " " " ص ۱۰۸

ایک دو خط شائع کیے تھے اور وہ بھی اس وقت جب ..... نے خود مضامین لکھے اور اپنے احباب سے لکھوائے ان مضامین کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ شکوہ صرف اس امر کا تھا کہ پرائویٹ خطوں میں تو مجھے لکھتے تھے اور لکھتے ہیں کہ تمھاری نیت پر کوئی حملہ نہیں۔ لیکن اخباروں میں اس کے برعکس لکھتے ہیں۔ میں نے خود ..... سے اس امر کی شکایت کی تھی اور نہایت صاف باطنی کے ساتھ لکھا تھا کہ آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں علمی بحث ہونی چاہیے، حریف کو بدنام کرنا مقصود نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو قائل کرنا اور راہ راست پر لانا ہے۔"

اسی خط سے اس کا علم ہوتا ہے کہ اس واقعہ نے علامہ اقبال کے دل میں تصوّف سے ایک تعلق پیدا کر دیا تھا اور وہ اس کی اشاعت سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ مقصد صرف یہ ہوگا کہ تصوف کی حقیقت سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اکبر الہ آبادی صاحب کو لکھتے ہیں:

"علامہ ابن جوزی نے جو کچھ تصوّف پر لکھا ہے اس کو شائع کر دینے کا مقصد اس کے ساتھ تصوف کی تاریخ پر ایک مفصل دیباچہ لکھوں گا۔ انشاء اللہ اس کا مصالحہ جمع کر لیا ہے۔ منصور حلاّج کا رسالہ "کتاب الحواسین" فرانس میں مع نہایت مفید حواشی کے شائع ہوگیا۔ اس کتاب کو استعمال کروں گا فرانسیسی مستشرق نے نہایت عمدہ حواشی دیے ہیں۔ رہبانیت کے متعلق جو آیہ شریفہ آپ کے خیال میں ہو ضرور لکھیے۔"[2]

مندرجہ بالا خط کے مطالعے سے اس کا احساس شدّت سے ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں حضرت خواجہ حسن نظامی سے متعلق کچھ بدگمانی ہو چکی تھی۔ اسی لیے لہجہ میں کچھ تلخی پیدا ہوگئی تھی، لیکن ۳۰ر جنوری کے مکتوب بنام مہاراجا کشن پرشاد سے اس بات کا احساس قطعی نہیں ہوتا۔ اقبال خواجہ صاحب کا ذکر کرتے ہیں مگر محض اس قدر:

"خواجہ حسن نظامی کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ سرکار حیدر آباد

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتب شیخ عطاء اللہ

[2] " " " "

سے روانہ ہوگئے [1]"

اکبرالہ آبادی کے مکتوب بنام خواجہ صاحب ۲۲ فروری ۱۹۱۶ء سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی اقبال کی بات پسند نہیں کی تھی بلکہ وہ خواجہ صاحب کے ہمنوا تھے لیکن اقبال کو چھوڑنا بھی پسند نہیں کرتے تھے خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں تو اقبال کے خیال سے متردد نظر آتے ہیں:

"پرچہ صوفی میرے پاس آتا ہے۔ آپ کا ریویو بھی دیکھ لیا اقبال صاحب کی پروفیسری فارسی شاعری کے ساتھ مل کر مشرق مغرب دونوں کے لیے بھیانک ہوگئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے .... اقبال سے زیادہ نہ لڑیے دعائے ترقی و دوستی اقبال کیجیے [2]"

پھر ۴ فروری ۱۹۱۶ء کو اکبرالہ آبادی سے مخاطب ہوتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"آپ کا والا نامہ مل گیا ہے میں تصوّف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں، جو ممکن ہے ایک کتاب بن جائے چونکہ خواجہ ... نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے ورنہ اس طویل مضمون کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

چونکہ میں نے خواجہ حافظ پر اعتراض کیا ہے اس واسطے ان کا خیال ہے میں تحریک تصوّف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں۔ "سرّ اسرار خودی" کے عنوان سے انھوں نے ایک مضمون خطیب میں لکھا ہے جو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ جو پانچ وجوہ انھوں نے مثنوی سے اختلاف کرنے کے لیے لکھے ہیں انھیں ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے تاریخ تصوّف سے فارغ ہو

---

[1] روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۱۳۹

[2] اکبر اور اقبال مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ص ۱۱۷

لوں تو تقویۃ الایمان کی طرف توجہ کروں فی الحال جو فرصت ملتی ہے وہ اس مضمون کی نذر ہو جاتی ہے۔

آپ کا قطعہ "حضرت اقبال اور خواجہ حسن" خوب رہا۔ صرف ایک بات ہے کہ خواجہ صاحب کو تو کبھی رقص اور سکر نصیب ہوتا ہوگا میں اس نعمت سے محروم ہوں[1]"

۱۲ر فروری ۱۹۱۶ء کو خان محمد نیاز الدین کے نام خط میں تصوّف کی تاریخ لکھنے کی خبر دیتے ہوئے خواجہ حسن نظامی کی شکایت کرتے ہیں:

"مثنوی کا دوسرا حصہ لکھنا چاہتا تھا مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی۔ تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں[2]"

شاہ سلیمان پھلواروی اس وقت غیر منقسم ہندستان کے ان علما میں شمار ہوتے تھے جن کا ہر طرح احترام کیا جاتا تھا، ان کے پاس بھی اس سلسلے میں خطوط پہنچے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایک خط میں تحریر کیا جو خطیب کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ اقبال نے اس مطبوعہ خط کا بغور مطالعہ کیا اور پھر ۲۴ر فروری ۱۹۱۶ء کو شاہ صاحب کی خدمت میں ایک خط لکھا جس کے بعض حصّے درج کیے جاتے ہیں۔

"آپ کا خط جو خطیب میں شائع ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ میری مثنوی "اسرار خودی" آپ تک نہیں پہنچی۔ ایک کاپی ارسال خدمت کرتا ہوں تاکہ آپ یہ اندازہ کر سکیں کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے جو اتہامات مجھ پر لگائے ہیں وہ کہاں تک درست ہیں۔

"آپ نے جو خط شائع کیا ہے اس کے حرف حرف سے مجھے اتفاق ہے اور میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے خدا لگتی بات کہی۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بدظنی نہیں بلکہ مجھے ان سے محبت ہے۔

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ پالوی ص ۵۱

[2] روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۱۴۱

"میرا یہ عقیدہ نہیں کہ جن بزرگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے انھوں نے قرمطی تحریک سے اضافہ کیا۔ یہ خواجہ حسن نظامی صاحب کا بہتان ہے

"یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ میں نے اپنی کسی تحریر میں کوئی سوالات نہیں کیے۔ خواجہ صاحب نے خود یہ تنقیحات قائم کی ہیں جو ان کے خیال میں میری تحریر سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ بات دیانت کے خلاف ہے کہ ان سوالوں کو جو خواجہ صاحب نے آپ کی خدمت میں ارسال کیے ہیں میری طرف منسوب کیا جائے اور ان کا نام "ڈاکٹر اقبال کے آٹھ سوال" رکھا ہے[1]"

مندرجہ بالا خط کا جواب شاہ صاحب نے شاید جلد ہی دیا جس کے جواب میں علامہ اقبال نے ۹/ مارچ ۱۹۱۶ء کو ایک خط پھر لکھا جس میں تحریر کیا:

"جناب کا والا نامہ (ملا) جس کو پڑھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ آپ کو مثنوی پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کمالِ روحانی کے ساتھ علم و فضل سے آراستہ کیا ہے میں نے خواجہ حسن نظامی کو بھی لکھا تھا کہ مثنوی سے اختلاف نہ کیجیے۔ دیباچے میں جو بحث ہے اس پر لکھیے۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے آج تک ایک حرف بھی اس کے متعلق نہیں لکھا۔ آپ کی تحریر سے مجھے یقیناً فائدہ ہوگا مگر میری استدعا ہے کہ مثنوی کے متعلق بھی جو خیال آپ نے خط میں ظاہر فرمایا ہے اس مضمون میں ظاہر فرمائیے کہ جو غلط فہمی خواجہ حسن نظامی کے مضامین سے پیدا ہوگئی ہے وہ دور ہو جائے۔ دیباچے کی بحث ایک علاحدہ بحث ہے ....

"تصوف کا میں کیوں کر مخالف ہو سکتا ہوں خود سلسلۂ عالیہ قادریہ سے تعلق رکھتا ہوں..... بعض لوگوں نے ضرور غیر اسلامی عناصر اس میں داخل کر دیے ہیں جو شخص غیر اسلامی عناصر کے خلاف

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۱۷۰-۱۸۰

صدائے احتجاج بلند کرتا ہے وہ تصوف کا خیر خواہ ہے نہ کہ مخالف۔[1]

۲/اپریل ۱۹۱۶ء کے مکتوب بنام مہاراجا کشن پرشاد شاد میں اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ:

"...... خواجہ حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں میرا عقیدہ ہے کہ ویسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ قوائے حیات کو کمزور اور ناتواں کرنے والی ہے۔"

پھر مہاراجا کشن پرشاد شاد کے ۷/اپریل کے مکتوب کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے پہلے ایک عریضہ لکھ چکا ہوں جس میں خواجہ حافظ اور خواجہ حسن نظامی کے متعلق عرض کیا تھا۔ یہ مثنوی جس کا نام "اسرار خودی" ہے۔ ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے مجھ کو یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے اور وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ اور برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے۔

مگر:

من صدائے شاعرِ فرد استم

اور:

نا امید ستم ز یاران قدیم   طورِ من سوزد کہ می آید کلیم

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، ص ۱۸۰

[2] روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۱۴۶

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا، نہ اقبال۔ یہ بیج جو مردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بارآور ہوگا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے الحمد للہ۔"

۱۰ر مئی ۱۹۱۶ء کو مہاراجا کشن پرشاد کے خط میں حافظ کی شاعری کے متعلق اپنے پرانے خیالات کا پھر اظہار کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ اپنے متعلق صاف لفظوں میں کہتے کہ وہ غیر معمولی ذہانت و فطانت کے آدمی نہیں ہیں:

"جو کیفیت خواجہ حافظ اپنے ریڈر کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ قوتِ حیات کو ضعیف و ناتواں کرنے والی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت دو طرح دیے جا سکتے ہیں، فلسفیانہ اور شاعرانہ۔ مقدم الذکر کا ثبوت اس مثنوی میں کوئی نہیں کیونکہ کتاب نظم ہے اور نظم میں فلسفیانہ ثبوت پیش نہیں کیے جا سکتے۔ شاعرانہ ثبوت منطقی اعتبار سے ضروری نہیں کہ صحیح ہوں، تاہم اس نقطۂ خیال سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ مثنوی میں جا بہ جا موجود ہے۔ اگرچہ میں کوئی غیر معمولی ذہانت فطانت رکھنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی غیر معمولی علم رکھتا ہوں، تاہم عام لوگوں سے علم اور سمجھ کسی قدر زیادہ رکھتا ہوں۔ جب مجھ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیس سال کی ضرورت ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ عام لوگ جو دنیا کی دماغی اور علمی تاریخ سے پورے واقف نہیں تھوڑے غور و فکر سے اس کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔ اعتراض کرنا دوسری بات ہے[1]"

اس خط کے جواب میں مہاراجا کشن پرشاد نے غالباً اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال نے مثنوی میں "جرمن فلسفہ" پیش کیا ہے جس کا جواب اقبال ۲۴ر جون کو اس طرح دیتے ہیں:

"تعجب ہے آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ میں نے جرمن فلسفہ اس مثنوی میں لکھا ہے۔ علمائے اسلام ابتدا سے آج تک تصوف وجودیہ

---

[1] روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۱۴۸

کے مخالف رہے ہیں، میں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ ہندوؤں میں کشن کی گیتا اس کے خلاف ایک زبردست آواز تھی۔ اسلامی تصوف کا دار و مدار "گستن" پر ہے تصوف وجودیہ کا "پیوستن" یا فنا پر۔ اگر میں نے گسستن کی حمایت کی ہے تو کوئی بدعت نہیں کی میرا ذاتی میلان پیوستن کی طرف ہے مگر وقت کا تقاضا اور ہے اور میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لکھنے پر مجبور تھا۔ دنیا مخالفت کرتی ہے تو کرے اس کی پروا نہیں۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنا فرض ادا کر دیا [1]"۔

۱۰ر جولائی ۱۹۱۶ کو سید فصیح اللہ کاظمی کے خط کا جواب دیتے ہوئے حافظ اور تصوف سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"۔۔۔۔ حافظ شیرازی سے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میری مثنوی "اسرار خودی" کا ایک جزو ہے جو حال میں فارسی میں شائع ہوئی ہے اس میں خواجہ حافظ کے تصوف پر اعتراض ہے۔

"میرے نزدیک تصوف وجودی مذہب اسلام کا کوئی جزو نہیں بلکہ مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ تعلیم غیر مسلم اقوام سے مسلمانوں میں آئی ہے۔ صوفی عبداللہ صاحب اس خیال کے اظہار سے قال سے حال میں آگئے مگر یہ ایک خاص علمی اور تاریخی بحث ہے۔ جس میں تاریخ و آثار سے تو مدد لینی چاہیے، گالیوں سے کام نہ چلے گا۔ صوفی عبداللہ نے گالیوں کی روش اختیار کی ہے اس کا جواب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

تصوف پر جو میرے خیالات ہیں ان کا اظہار میں متعدد مضامین میں کر چکا ہوں، جو وکیل اخبار (امرتسر) میں شائع ہوئے ہیں۔ [2]"

اسرار خودی پر اعتراضات کے جواب کے سلسلے میں علامہ نے حسب ذیل مضامین تحریر کیے جو ہفتہ وار وکیل جنوری ۱۹۱۶ء سے دسمبر ۱۹۱۶ء کے درمیان شائع

---

[1] روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۱۵۰

[2] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۲۰

ہوئے :

اسرار خودی اور تصوف	وکیل امرتسر	۱۵ر جنوری ۱۹۱۶ء
سرّ اسرار خودی	〃 〃	۹ ر فروری ۱۹۱۶ء
علم ظاہر و علم باطن	〃 〃	۲۸ ر جون ۱۹۱۶ء
تصوف وجودیہ	〃 〃	۱۲ ر دسمبر ۱۹۱۶ء

اس بحث و مباحثہ، سوال و جواب، تلخی اور ترشی اور نرمی و گرمی کے دوران اکبر الہ آبادی کوشش کرتے رہے کہ کوئی مفاہمت کی صورت پیدا ہو اور اس کوشش میں اکبر اس طرح کامیاب ہوئے کہ خواجہ صاحب کا اگست ۱۹۱۶ء کو اس طرح کا خط ملا :

"میں نے اپنی طرف سے ضد اور سرکشی کو کبھی قائم نہیں رکھا، ہر اصلاح طلب خیال کے آگے جھک گیا، اس کے بعد بھی دل صاف نہ ہو تو ضمیر خودداری کو ذلت سمجھتا ہے اور بندے کو خدا ہونے کی ترنگ آتی ہے اور خیال ہر قوت کو ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال اور میرا کیا مقابلہ، ان کے ہاتھ پانو ہیں میں بے دست و پا ہوں۔ غدر کے زمانے میں مسٹر مٹکاف نے میرے دادا کو پکڑا تو کہا کہ تمھارے ہتھیار کہاں ہیں۔ انھوں نے جیب سے تسبیح نکالی اور کہا یہ موجود ہیں۔

تب بھی اقبال کو میرے سامنے مجھ کو خوش کرنے کو بڑا کہا جاتا ہے تو خود بخود جی دکھتا ہے۔ بعض اوقات لڑنے لگتا ہوں، اس وقت خیال کہتا ہے اقبال میرے دوست ہیں۔ ان کو کوئی دوسرا برا کیوں کہے[1]۔"

اکبر الہ آبادی کی کوششیں بار آور ہوئیں، اقبال نے خواجہ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اکبر اس کامیابی پر بے حد خوش ہوئے جس کا اظہار انھوں نے اپنے مکتوب ۹ اگست ۱۹۱۶ء بنام خواجہ حسن نظامی اس طرح کیا :

"میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا میں نے ان کا خط دیکھ کر آپ کو مخاطب کر کے چند شعر کہے :

---

[1] اکبر و اقبال مرتبہ غلام حسین ذوالفقار ص ۱۱۸

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد — قومی کارکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی
تم محو ہو حُسن کی تجلّی میں اگر — ہیں دشمنِ فتنۂ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لیے جنوں ہے تم کو اگر — دیووں کے لیے بنے سلیماں وہ بھی[1]

پھر لکھنؤ سے ۲۴ اگست ۱۹۱۶ء کو خواجہ حسن نظامی کو ان کے خط کا جواب دیتے ہوئے اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

"میں نے اقبال صاحب کو لکھا تھا کہ حسن نظامی سے محبت رکھنی چاہیے۔ انھوں نے لکھا کہ محبت تو رکھتا ہوں لیکن وہ میرے طریقہ سے اظہار مخالفت کرتے ہیں، میں نے لکھا کہ آپ کو محبت اس لیے رکھنی چاہیے کہ خواجہ صاحب کتنا ہی اظہار بے خودی کریں لیکن عملی حالت میں آپ کے شریک غالب ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ پونے دو سال ہو گئے ملنا میسّر نہیں ہوا اس خط کا جواب نہیں آیا۔ حال میں لکھا ہے۔ آپ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اقبال صاحب کے مقاصد کی میں قدر کرتا ہوں، لیکن جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ دل شکن اور ضرر رساں ہے۔ سوشل تعلقات کی شیرینی رخصت ہوتی ہے۔
جو کچھ ہو میرے نزدیک ہم کو بہ لحاظ ہماری حالت کے نیکی اور سلامت روی کے ساتھ طاعت باری میں مصروف ہونا چاہیے۔"[2]

اکبر الہ آبادی پھر ۶ نومبر ۱۹۱۶ء کو خواجہ صاحب کو اطلاع دیتے ہیں:

"اقبال صاحب کا خط آیا ہے لکھتے ہیں میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں صرف چند مسائل سے اختلاف ہے، جو کچھ ہو شکستگیِ دل بُری چیز ہے یا گداز دل کہیے۔ یہ نہیں تو وہ رنگ نہیں۔ میں نے لکھ دیا کہ خواہش یہی ہے کہ آپ خوب قلوب رہیں۔ میں تو عبرت و آلام کے ہاتھوں مردہ ہو گیا، میں ہوں اور ایک دوسرا عالم ہے اور اس کی اصلاح کے لیے کیا کہنا اور کیا کرنا چاہیے۔

---

[1] اکبر و اقبال مرتبہ غلام حسین ذوالفقار ص ۱۱۸
[2] " " " " ص ۱۱۹

آمادہ حریف ہیں ستانے کے لیے اور دکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے بہت مرجاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

اس دوران میں تصوف اور حافظ شیرازی کے سلسلے میں جن حضرات سے علامہ اقبال کی خط و کتابت رہی ان میں مہاراجا کرشن پرشاد شاؔد، شاہ سلیمان پھلواروی اور خاص طور سے حضرت اکبر الہ آبادی کے نام لیے جاتے ہیں جو ڈاکٹر اقبال اور حضرت خواجہ حسن نظامی کے قضیے سے دلچسپی اس لیے ضرور لے رہے تھے کہ کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہو اور دونوں دوستوں میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں، ان حضرات کے خطوط کے مطالعے سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی سے متعلق نہیں ہوئے بلکہ صلح و صفائی کے دل سے خواہشمند رہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے یہ بات خطوط کے مطالعہ سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ وہ ان حضرات کو تصوف اور حافظ کے سلسلے میں اپنی بات سمجھانے میں اگرچہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے تھے لیکن ان کی شخصیت چونکہ سب کو محبوب تھی اس لیے کوئی بھی اُن کی دل شکنی نہیں چاہتا تھا۔ اور دونوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے سب فکرمند تھے۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری صاحب پورے واقعہ کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت صحیح نتیجہ پر پہنچے تھے وہ تحریر کرتے ہیں:

"ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں خواجہ صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا کیونکہ اس وجہ سے ایک تو خود اُن کی ذات پر حملے ہونے لگے ..... دوسرے نفس مسئلہ جو مفید تھا ان ناگوار بحثوں کے حجاب میں آگیا[1]"

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں حضرت اکبر الہ آبادی نے نہایت اچھا قدم اٹھایا اور اس واقعہ سے پوری طرح دلچسپی لے کر دونوں بزرگوں میں خوشگوار تعلقات پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی، جس کا اعتراف حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"حضرت اکبر بھی اقبال کے قدرداں تھے اور میں بھی قدرداں ہوں۔ اقبال میرے بہت بڑے دوست تھے مثنوی اسرار خودی اور تصوّف کی مخالفت کے سبب میرا اُن کا اختلاف ہوگیا۔ مگر اس اختلاف نے میرے

---

[1] مثنوی اسرار خودی از محمد اسلم جیراجپوری: اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں ص ۵۴

دل کو اقبال کی عظمت تسلیم کرنے سے محروم نہیں کیا[1]"

خواجہ صاحب نے اپنے ایک مضمون "اقبال اور حسن نظامی" میں اس واقعہ کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی عظمت نگاہوں میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے وہ لکھتے ہیں :

"گذشتہ ایام میں جناب شیخ اقبال صاحب بیرسٹر پی۔ ایچ۔ ڈی اور حسن نظامی کے درمیان مسئلہ تصوف میں اختلاف واقعے ہوا تھا، گفتگو آگے بڑھتی مگر ایک طرف تو جناب ڈاکٹر صاحب کو مولانا سیّد اکبر حسین صاحب الہ بادی نے روکا اور دوسری جانب مجھے بھی ممانعت فرمائی۔ میں حضرت اکبر کی ذات کو اپنا مرشد معنوی تصور کرتا ہوں اس لیے اس گفتگو سے دست بردار ہوگیا اور خلقت کی اس شہرت کو برداشت کرتا رہا کہ حسن نظامی اقبال سے علمی بحث نہ کرسکا کیونکہ بدنامی بہتر تھی اپنے رہنمائے روح کی عدم تعمیل ارشاد سے[2]"

سچ یہ ہے کہ دو دوستوں میں کشیدگی کی جو صورت پیدا ہو رہی تھی وہ اکبر الہ آبادی اور شاہ سلیمان پھلواروی کی کوششوں سے ختم ہونے لگی تھی کہ "ستارہ صبح لاہور" میں ظفر علی خاں کے کچھ ایسے مضامین شائع ہونے لگے جن سے خواجہ حسن نظامی صاحب کو مغالطہ ہوا کہ ان تحریروں کے پیچھے اقبال ہیں بعض حضرات نے اس سلسلے میں اقبال کے خلاف یقین دلانے کی کوشش کی. وہ تو خیریت ہوئی کہ میر غلام بھیک نیرنگ نے حقیقت سے خواجہ صاحب کو آگاہ کیا اور اس طرح دونوں کے درمیان دوبارہ تعلقات خراب ہونے سے بچ گئے چنانچہ اس کا اعتراف خواجہ صاحب نے اپنے ایک خط بنام ڈاکٹر اقبال میں اس طرح کیا ہے :

محب الفقراء جناب شیخ ڈاکٹر محمد اقبال

السلام علیکم

---

[1] خطوط اکبر مرتبہ خواجہ حسن نظامی ص ۱۹

[2] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۱۸۶ حاشیہ

"آج مجتبیٰ میر نیرنگ صاحب (غلام بھیک مرحوم) کے خط نے مجھے ایک بڑے مغالطے سے بچا لیا اور میں ان کا از حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی ذاتی طمانیت کا اظہار کر کے مجھ کو ایک بدگمانی کے گناہ سے نجات دی، میں آپ سے معذرت کرنے کو یہ خط لکھتا ہوں۔ مجھے لاہور کے متعدد حضرات نے تحریری و زبانی اطلاعیں دی تھیں کہ "اخبار ستارہ صبح" (لاہور) کی آڑ میں آپ ہیں مگر مجھے نیرنگ صاحب کا سب سے زیادہ یقین ہے اس لیے میں اپنی بدگمانی کو واپس لے کر آپ سے عذر کرتا ہوں۔ اب مجھے اس تگ و دو میں آپ سے کوئی سرور کار نہ ہوگا۔"[1]

اس خط کے جواب میں لاہور سے ۱۱ جنوری ۱۹۱۸ء کو علامہ اقبال نے یہ تحریر کیا:

"آپ کو معلوم ہے تقریباً دو سال ہوئے میں نے ان اعتراضات کے جواب میں جو آپ نے مثنوی "اسرار خودی" پر کیے تھے چند مضامین مسائل تصوف پر لکھے تھے، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسئلہ "وحدت الوجود" ان معنوں میں کہ ذات باری تعالیٰ ہر شے کی عین ہے قرآن سے ثابت نہیں اور روحانیت میں اسلامی تربیت کا طریق "صحو" نہ کہ "سُکر"۔ آپ ہی کے اخبار "خطیب" میں حضرت صوفی قاری شاہ سلیمان نے ان دونوں مسائل کے متعلق میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ باوجود اس کے کہ مجھے ہمیشہ اس بات کا تعجب رہا کہ آپ اور آپ کے احباب اس اختلاف کی وجہ سے مجھے کیوں دشمن تصوف سمجھتے ہیں؛ یہ اختلاف کوئی نئی بات نہیں بلکہ حضرات صوفیہ میں ایک عرصہ سے موجود ہے۔ بہرحال جن خیالات کا اظہار میں نے اخبار "وکیل" میں کیا تھا اُن کی صحت و صداقت کا مجھے اب تک یقین ہے گو اُن پر بحث کرنا کئی وجوہ سے غیر ضروری جانتا ہوں، عوام بلکہ خواص کو بھی اِن اصولی امور میں کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس قسم کے مباحث اخباروں کے لیے موزوں ہیں اِن سب باتوں کے علاوہ مولانا اکبر (الہ آبادی)

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۱۸۳

نے جن کا ادب و احترام میں اس طرح کرتا ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا احترام کرے۔ مجھے لکھا کہ یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اس دن سے آج تک میں نے ایک سطر بھی ان مباحث میں نہیں لکھی۔ گو ذاتی فائدے کے خیال سے مطالعہ جاری رکھتا ہوں، اب جو مولوی ظفر علی خاں صاحب نے اخبار "ستارہ صبح" میں یہ بحث دوبارہ چھیڑی تو بہ وجہ ان دیرینہ تعلقات کے جو میرے اور اُن کے درمیان ہیں اور نیز اس وجہ سے کہ اس بحث میں مجھے کمال دلچسپی ہے بعض لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ "ستارہ صبح" کے مضامین میں لکھتا ہوں یا لکھواتا ہوں ــ! لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے قلم سے ایک سطر بھی اس بحث پر نہ نکلی اور نہ میں نے مولوی صاحب موصوف (ظفر علی خاں) کو کوئی مضمون لکھنے کی تحریک کی ہے بلکہ پرائویٹ گفتگو میں کئی امور میں میں نے ان سے اختلاف کیا ہے! اس کے علاوہ میں تو اصول بحث کو جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں اخباروں کے لیے موزوں نہیں سمجھتا چہ جائے کہ کسی اور کو اس کے جاری رکھنے کی تحریک کروں، البتہ موجودہ نتائج کے حالات پر لکھنے اور ہمدردانہ لہجے میں ان کے خیالات و رسوم کی تنقید کرنے سے قوم کو ضرور فائدہ ہوگا۔ اگر مولوی ظفر علی خاں یا آپ اس طرف توجہ کریں تو "چشم ما روشن و دل ما شاد"

غرض کہ آپ کو میری نسبت بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور اگر کسی وجہ سے بدگمانی ہو بھی گئی تو آپ مجھ سے براہ راست دریافت کر سکتے تھے۔ لوگ تو اس قسم کی بات تو اڑایا ہی کرتے ہیں، دو چار روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے بیان کیا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے مشہور کر رکھا ہے کہ اقبال نے اپنی ٹوپی ہمارے قدموں پر رکھ کر ہم سے معافی مانگی ہے اور آیندہ کے لیے توبہ کی ہے۔ میں نے انھیں یہ جواب دیا کہ جن لوگوں کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت ہے اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا سر رکھنے کو تیار ہے! اور ان کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتا ہے لیکن جو بات خواجہ حسن نظامی

کی طرف منسوب کرتے ہو تو اس کے لغو ہونے میں کوئی شبہ نہیں ،
زیادہ کیا عرض کروں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا، آپ چاہیں تو
یہ خط شائع کر سکتے ہیں، والسلام[1]"

۲۵ر جولائی ۱۹۱۸ء کا مکتوب بنام اکبر الہ آبادی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد اقبال اور خواجہ کے درمیان پر خلوص تعلقات کا پوری طرح احساس ہوتا ہے، اقبال لکھتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی کا خط مجھے بھی آیا تھا اور میرا قصد بھی فاتحہ جناب امیر میں شریک ہونے کا تھا مگر افسوس ہے کہ میری بیوی کچھ عرصہ سے بیمار ہے اور ابھی تک روبصحت کامل طور پر نہیں ہوئیں، خواجہ صاحب کو بھی میں نے یہی لکھا تھا کہ وہ اچھی ہوگئیں تو ضرور حاضر ہوں گا، اگر اب نہ جاسکا تو تعطیلوں میں انشاء اللہ دہلی جانے کا قصد ہے کہ ایک مدت سے آستانہ حضرت محبوب الٰہی پر حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں، کیا عجب ہے کہ ان گرما کی تعطیلوں میں اللہ اس ارادے کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، خواجہ حسن نظامی سے مجھے دلی محبت ہے جس پر اختلاف خیال کوئی اثر نہیں کر سکتا اور اصل بات تو یہ ہے کہ وہ اختلاف بھی کم از کم میرے علم اور سمجھ کے مطابق کوئی ایسا اختلاف نہیں، وہ کچھ عرصہ ہوا یہاں تشریف لائے تھے، میں نے اصرار کیا کہ وہ ایک روز قیام فرمائیں لیکن وہ ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ زبانی باتیں ہوئیں تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہوا اس سے محبت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی جو مجھ کو اُن سے ہے وہ ایک نہایت محبوب آدمی ہیں اُن کو جان کر اُن سے محبت نہ رکھنا ممکن نہیں[2]"

غالباً اسی ۱۹۱۸ء میں "اکبری اقبال" کی اشاعت عمل میں آئی، جس میں اقبال

---

[1] انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۱۸۴

[2] اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۶۳

کے چند مزاحیہ قطعات شامل کیے گئے تھے جس کی تمہید میں خواجہ حسن نظامی پروفیسر محمد اقبال کے بارے میں اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"میں نے ان کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ بیٹھیں ورنہ میں اقبال کو پیکر خاک نہیں سمجھتا اور اُن کے پُتلے کو آدم زاد نہیں مانتا، ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر ان کی بشریت فقط ان کی بیوی بچوں یا اُن کے لیے مبارک ہو جو ان کو گورا چِٹا مونچھوں والا عقلمند پروفیسر و بیرسٹر کہتے ہیں۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی اور سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی، یورپین اقبال کو بھی دیکھا ہے، اور لندنی اقبال کو بھی مگر کبھی آدمی نہیں پایا وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیات ابدی کے نشان ہیں۔ ہندستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں لیے"

اقبال کے ۲۶ فروری ۱۹۱۹ء کے مکتوب بنام مہاراجا کشن پرشاد سے بھی خواجہ حسن نظامی سے گہرے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"۲۸ فروری کو دہلی جانے کا قصد ہے وہاں سے ممکن ہوا تو سرکار خواجہ میں بھی حاضر ہوں گا، خواجہ حسن نظامی رفیق ہوں گے تو کیا عجب کہ:

دل بیتاب جا پہنچے دیار پیر سنجر میں   میسر ہے جہاں درمانِ دردِ ناشکیبائی ؎

پھر ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو مہاراجا کشن پرشاد ہی کو آگاہ کرتے ہیں:

"دہلی تو گیا تھا اور دو دفعہ حضرت خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا تھا، مگر افسوس کہ پیر سنجر کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔

لے اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۴۲،

ٹے روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۲۲۱

خواجہ حسن نظامی نے بہت اچھی قوالی سنائی [1]"

مکتوب بنام مہاراجا کشن پرشاد ۲۷/ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں خواجہ صاحب کو ہم سفر بنانے کی دلی خواہش کا اظہار ملتا ہے، لکھتے ہیں:

"..... میرا قصد بھی ان (مولانا تاج الدین) کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے آج خواجہ سید حسن نظامی صاحب کو بھی لکھا ہے اگر وہ بھی ہم سفر ہو گئے تو مزید لطف رہے گا...[2]"

۱۹۲۸ء میں علامہ اقبال گردے کی تکلیف میں مبتلا ہوئے علاج ہوا لیکن فائدہ نہ ہوا تو آپریشن کے لیے سری نگر جانے کا طے ہوا، علامہ نے اس کی اطلاع خواجہ حسن نظامی صاحب کو دی تو انھوں نے حکیم نابینا سے علاج کا مشورہ دیا چنانچہ علامہ نے ان کا علاج کرایا اور اس وقت فائدہ ہوا، ملا واحدی صاحب اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

"علامہ اقبال نے خواجہ صاحب کو اطلاع دی کہ گردے کا آپریشن کرنے سری نگر (کشمیر) جارہا ہوں، پنجاب کا سب سے بڑا انگریز سرجن آج کل سری نگر میں ہے، سر سکندر حیات خاں نے اس سے میری سفارش کی ہے سر سکندر حیات اس وقت پنجاب کے ایکٹنگ گورنر تھے، خواجہ صاحب نے علامہ اقبال کو جواب دیا کہ ذرا حکیم نابینا کا تجربہ کرتے جائیے۔ علامہ اقبال دہلی تشریف لائے، خواجہ صاحب نے انھیں بیگم کے باغ کے پاس ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور حکیم نابینا صاحب کو لاکر دکھایا، ناقابل بیان تکلیف تھی کسی کروٹ چین نہیں تھا، حکیم نابینا صاحب نے دوا دی؛ اللہ کے فضل سے تین دن میں تکلیف جاتی رہی۔ پتھری ریزہ ریزہ ہو کر نکل گئی۔ آٹھویں دن حکیم نابینا صاحب نے فرمایا۔ اب آپ لاہور جائیے دوا لاہور پہنچتی رہے گی [3]"

۱۹۲۳ء خواجہ حسن نظامی صاحب لاہور گئے تھے جہاں علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی

---

[1] روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی ص ۲۲۵

[2] " " " " ص ۲۷۰

[3] اقبال کے ہم صفیر از ایس۔ ایم۔ ناز ص ۱۴۴

جس کی روداد ہفتہ وار روزنامچہ دہلی ۲۴/اپریل ۱۹۳۲ء میں اس طرح شائع ہوئی:

"پنجاب کے راجا پورس کو شکست دینے والے سکندر سے رخصت ہوکر ڈاکٹر محمد اقبال سے ملنے گیا، ایشیا کا سب سے بڑا شاعر کمرے کے اندر دکھائی دیا۔ اس کا انیس حقہ بھی سامنے موجود تھا، مجھ کو یہ شخص ٹیگور اور شیکسپیر سے کئی ہزار فٹ اونچا نظر آتا ہے اگر میری آنکھوں میں محبت کے زخم ہیں اور اس کی وجہ سے میری نگاہ درست نہیں رہی ہے تب بھی سخن فہم مجھ سے یہی کہیں گے کہ ٹیگور اور سکسپیئر سے یہ شخص کئی ہزار فٹ نہیں تو چھے فیٹ تو ضرور زیادہ اونچا ہے[1]۔"

یہ بات نہیں تھی کہ صرف خواجہ حسن نظامی صاحب ہی اقبال کی صلاحیتوں کے معترف تھے، اقبال بھی ان کے بڑے قدرداں تھے ایک موقع پر انھوں نے خواجہ صاحب کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

"زمانہ حال کے اردو لٹریچر میں خواجہ حسن نظامی کا طرز تحریر اپنی سادگی اور سوز و گداز کے اعتبار سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اردو لکھنے والوں میں خواجہ موصوف نے مولانا آزاد کی طرح اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے[2]۔"

۱۹۳۵ء میں دہلی میں "غالب سوسائٹی" کی بنیاد لالہ سری رام (مصنف خمخانۂ جاوید) کے دولت کدہ پر ڈالی گئی۔ اہل دہلی جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے انھوں نے اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ۱۵/فروری ۱۹۳۶ء کو دہلی میں پہلا یوم غالب منانے کا فیصلہ کیا، جس میں شرکت کے لیے خواجہ صاحب نے مقامی اور بیرونی ہندو مسلم مشاہیر کو دعوت دی۔ علامہ اقبال ان دنوں حلق کی تکلیف میں مبتلا تھے اس لیے شرکت سے معذور تھے البتہ اپنا حسب ذیل پیغام حضرت خواجہ حسن نظامی کے نام بھیجا:

---

[1] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۲۹

[2] نذر اقبال: افکار کراچی ص ۱۰۰

"جناب خواجہ صاحب!

دوسال سے علیل ہوں:

سخن اے ہم نشیں از من چہ خواہی کہ من بے خویش دارم گفتگوے

پیغام کے لیے مراقبہ کیا تو مرزا ہرگوپال تفتہ مرحوم کی روح سامنے آئی اور دلّی والوں کے لیے دو شعر نازل کر کے غائب ہوگئی:

دریں محفل کہ افسون فرنگ از خود ربود آور
نگاہ پردہ سوز آور، ولے دانائے راز آور
مے ایں ساقیانِ لالہ رو ذوقے نمی بخشد
ز فیض حضرت غالب ہماں پیمانہ باز آور

زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ دعا کا محتاج ہوں۔ ہاں دہلی کے پنڈتوں سے سلام کہہ دیجیے[1]"

شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اقبال کو خواجہ صاحب نہایت تعلق کی وجہ سے لاہور کے شیخین کہا کرتے تھے اور ایک موقع پر "سرّ الوصال" کے نام سے یاد کیا، رحیم بخش شاہین لکھتے ہیں:

"خواجہ حسن نظامی نے "خطیب" میں ہندستانی رہنماؤں اور اہم شخصیتوں کے خاکے لکھنے شروع کیے تھے، ایک خاکہ علاّمہ اقبال کا بھی ہے جو ۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء کے "خطیب" میں شائع ہوا:

سرّ الوصال ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال مسلمانوں کے نہیں بلکہ کل ہندستان کے، قومی شاعر ہیں، اگر ان کے خیالات را بندر ناتھ ٹیگور کی طرح انگریزی میں ترجمہ ہوکر یورپ میں شائع ہوتے تو یقیناً اہل یورپ بھی انھیں کو ہندستان کا ملکی شاعر تصور کرتے۔ اقبال کی نظموں میں موجودہ سیاست کی ہلچل سے پہلے تمام اسرار کی جھلک نظر آتی ہے، جو آج کل لوگوں کا طرز عمل

---

[1] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۷۴

ہے۔ مگر مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ بجائے اس کے کہ اقبال اپنی شاعرانہ حیثیت کو منتہائے کمال تک پہنچاتے وہ ایک بیرسٹر بن گئے جہاں ان کو قانونی تخیلات کے کنویں میں اپنے شاعرانہ سمندر برباد کرنے پڑتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی خاموشی بالکل حق بجانب ہے اور دوسروں کی تقلید کے قابل ہے مگر خدا کرے کہ نہ وہ ہمیشہ خاموش رہیں اور نہ بیرسٹر[1]"

اور اقبال کی وفات پر ہفتہ روزہ، منادی دہلی ۲۹ اپریل ۱۹۳۸ء میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار کیا۔

"میرے دوست اور فلسفیانہ شاعری کے آفتاب جناب ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب نے جمعرات کے دن ۱۹ صفر ۱۳۵۷ھ صبح صادق کے وقت اس دنیا سے کوچ فرمایا۔ وہ چونکہ محب اہل بیت تھے اور رجحان تفضیلی رکھتے تھے اس لیے قدرت نے ان کو چہلم شہید الشہدا علیہ السلام سے ایک دن پہلے کی تاریخ عطا فرمائی۔

ہندستان کے ہر باشندہ نے چھوٹا ہو یا بڑا اس صدمہ کو قومی اور ملکی محسوس کیا اور ہندستان کے باہر بھی ایک تہلکہ برپا ہوگیا جس سے اُن کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے[2]"

تقسیم ہند کے بعد خواجہ صاحب نے ایک موقع پر کہا:

"میرا ایمان ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صرف ہندستان ہی کے نہیں بلکہ پورے ایشیا کے ہیرو اور لیڈر تھے اور ایشیا کی بیداری ان کی برکات باطن کا نتیجہ تھا[3]"

خواجہ حسن نظامی نے ہندستان اور پاکستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں

---

[1] اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۲۵

[2] اقبال کے ہم صفیر: ام ایس ناز ص ۲۵ - اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین ص ۹۰۴

[3] خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۱۱۲

کے درمیان علمی تعلقات پیدا کرنے کے لیے نومبر ۱۹۵۱ء میں "پریم سنگم" نام سے ایک کتابچہ اس تحریر کے ساتھ شائع کیا تھا:

"حمد اور درود کے بعد حسن نظامی دہلوی عرض کرتا ہے کہ پریم سنگم مجھے مہاراجا سر کرشن پرشاد مرحوم وزیر اعظم حیدرآباد نے دی تھی جس کے شروع میں مہاراجا بہادر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک عبارت بھی ہے چونکہ آج کل ہندو مسلم ملاپ کے لیے ایسی چیزوں کی اشاعت مفید ہے اس لیے اس کو شائع کرتا ہوں[1]۔"

اور "نذر ارواح" کے تحت خواجہ صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے:

"ہندو مسلمانوں کے دو شہرہ آفاق اہل علم ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم اور مہاراجا سر کشن پرشاد مرحوم کا یہ ملا جُلا فارسی کلام ان دونوں نامی گرامی شاعروں کی ارواح کی نذر کرکے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تقسیم ہند کے سبب جو اختلاف ہندو مسلمانوں میں پیدا ہوگیا ہے وہ ہندو مسلمانوں کے ملے جلے فارسی کلام کی اشاعت سے دور ہوجائے اور ایران افغانستان وغیرہ فارسی بولنے والے ملک آگاہ ہوں کہ بھارت اور پاکستان کے ہندو مسلمان فارسی زبان سے بے بہرہ نہیں۔"

حسن نظامی

صفر ۱۳۷۱ھ نومبر ۱۹۵۱ء

اور ۱۹۵۲ء میں لاہور میں یوم اقبال کے موقع پر خواجہ صاحب نے ان تاثرات کا اظہار کیا:

"میں نے کہا تھا کہ میری اور اقبال کی صلح و صفائی ہوگئی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے میرے اور خواجہ نظام الدین اولیا کی شان میں قصیدے

---

[1] نذر اقبال: افکار کراچی دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۸

لکھے تھے اس لیے میں جلسۂ عام میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھ میں اور
اقبال میں کسی قسم کا اختلاف باقی نہیں رہا تھا۔[1]"

الغرض حضرت خواجہ حسن نظامی اور علامہ اقبال کے تعلقات کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور ان دونوں حضرات سے آگاہ ہونے کے لیے اہم ہے۔ لیکن ان چند اوراق میں کسی خاص نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں، اس کے باوجود کوشش کی گئی ہے کہ کسی اہم نتیجہ پر پہنچا جائے اور دونوں کے پُرخلوص رشتوں کو سمجھا جائے اور اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوا جائے، اس رشتہ کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد اقبال کے خطوط سے ملی ہے لیکن بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ایسے بہت سے خطوط محفوظ نہیں کیے جا سکے ہیں یا اب تک منظر عام پر نہیں آسکے ہیں جن کے مطالعہ سے اس موضوع کو سمجھنے میں مدد ملتی، میری نظر سے اقبال کے خواجہ حسن نظامی کے نام کل اکیس خط گزرے ہیں جو اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ، انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار اور خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی میں محفوظ ہیں۔ ان خطوط میں پہلا خط ۲۲ر جولائی ۱۹۰۴ء کا ہے اور آخری ۱۵ر فروری ۱۹۳۶ء کا ہے گویا یہ اکیس خطوط تقریباً ۳۳ سال کا سرمایہ ہیں ان کے علاوہ بعض ان خطوط سے بھی میں نے مواد حاصل کیے ہیں جو اقبال نے اکبر الہ آبادی مہاراجا کرشن پرشاد، قاری شاہ سلیمان پھلواروی، سید سلیمان ندوی وغیرہ کو لکھے تھے یا اکبر الہ آبادی کے ان خطوط سے فائدہ اٹھایا ہے جو انھوں نے مختلف موقعوں سے اقبال یا خواجہ حسن نظامی یا دوسروں کو بھیجے تھے لیکن سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اقبال اور خواجہ حسن نظامی کے رشتے کو سمجھنے کے لیے خطوط اقبال کی طرح خواجہ صاحب کے خطوط بھی بہت اہم ہیں لیکن میری نظر سے ان کا صرف ایک ہی خط گزرا ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کو ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا خواجہ صاحب کے وہ خطوط جو انھوں نے اقبال کو لکھے ہیں یا وہ خطوط جو انھوں نے اقبال کے سلسلے میں دوسروں کو لکھے ہیں خاص طور سے اکبر الہ آبادی کو، اگر مل جائیں تو ادب کی خدمت تو ہوئے گی ہی، ان دونوں بزرگوں کے مزاج، افکار اور تعلقات

---

[1] نذر اقبال: افکار کراچی۔ اقبال اور خواجہ حسن نظامی: ریاض صدیقی ص ۱۰۱

کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملے گی، دستیاب خطوط کے مطالعہ سے اس بات کا صاف پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال جن حضرات کو خط لکھا کرتے تھے ان میں سب سے زیادہ قربت اور بے تکلفی خواجہ حسن نظامی کے نام خطوط میں محسوس ہوتی ہے۔ سرنامے جہاں اس طرح کے ہیں خواجہ صاحب مکرم، جناب خواجہ صاحب، مخدومی خواجہ صاحب، وہاں اسرار قدیم سیّد حسن نظامی، پُر اسرار نظامی، سرمست سیّاح کو سلام، ڈیر نظامی بھی ہیں، جو دونوں کے تعلقات پر پڑے ہوئے دبیز پردے کو ہٹاتے محسوس ہوتے ہیں۔

کتابیات

کلیاتِ اقبال — مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق عماد پریس حیدرآباد دکن ۱۳۴۳ھ

رختِ سفر — مرتبہ محمد انور حارث مشہور آفسٹ پریس کراچی نقش اول جنوری ۱۹۵۲ء

سرود رفتہ — مرتبہ غلام رسول مہر و صادق علی دلاوری: شیخ غلام اینڈ سنز لاہور بار اول ۱۹۵۹ء

تبرکاتِ اقبال — مرتبہ بشیر الحق دسنوی عارف پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی

نوادرِ اقبال — مرتبہ عبدالغفار شکیل سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۳۷۷ھ

بانگِ درا — اقبال پاکستان ٹائمز پریس لاہور اکتوبر ۱۹۵۹ء

بالِ جبریل — 〃 شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، کراچی طبع یازدہم دسمبر ۱۹۵۹ء

ضربِ کلیم — 〃 زیر نگرانی چودھر محمد حسین طبع دہم دسمبر ۱۹۵۹ء

اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ شیخ محمد شرف الدین، تاجر کتب کشمیری بازار لاہور

اقبال نامہ حصہ دوم 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۹۵۱ء

باقیاتِ اقبال — مرتبہ عبدالواحد معینی نیو تاج آفس دہلی

خطوطِ اقبال — مرتبہ رفیع الدین ہاشمی مکتبہ خیابان ادب، لاہور بار اول ۱۹۷۶ء

مکتوباتِ اقبال — مرتبہ سید نذیر نیازی اقبال اکیڈمی کراچی

روزگارِ فقیر (جلد اول) از فقیر سید وحید الدین لائن آرٹ پریس (کراچی) لمیٹڈ بار ششم اپریل ۱۹۶۶ء

فکرِ اقبال — از خلیفہ عبدالحکیم مجلس ترقی ادب۔ لاہور بار اوّل ۱۹۵۷ء

اقبال کامل — از عبدالسلام ندوی مطبع معارف اعظم گڑھ: طبع دوم ۱۹۶۴ء

تلمیحات و اشاراتِ اقبال از اکبر حسین قریشی

ذکراقبال ازعبدالمجید سالک بزم اقبال لاہور جون ۱۹۵۵ء
یادگاراقبال مرتبہ سید محمد طفیل احمد بدرامروہوی
شعراقبال ازسید عابد علی عابد بزم اقبال لاہور سال اشاعت ۱۹۵۹ء
حیاتِ اقبال ازعنایت اللہ تاج کمپنی لاہور
انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار اقبال اکادمی کراچی طبع اوّل مارچ ۱۹۶۷ء
یاد اقبال مرتبہ چودھری غلام سرور فگار اقبال اکادمی لاہور بار دوم ۱۹۴۴ء
جدید شاعری ازعبدالقادر سروری
تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ مترجمہ مرزا محمد عسکری چوتھی بار ۱۹۵۲ء
گلستان ہزار رنگ مرتبہ سیّد بہاء الدین احمد ادارہ اشاعت اردو، امروہہ نقش دوم ۱۹۷۱ء
رموز بے خودی طبع اول ۱۹۱۵ء
مضامین اقبال
شرح بانگِ درا از غلام رسول مہر کتاب منزل لاہور اشاعت اوّل
خم خانہ جاوید جلد اوّل
اقبال کے ابتدائی افکار از ڈاکٹر عبدالحق جمال پرنٹنگ پریس دہلی. نقش اول مارچ ۱۹۶۹ء
اقبال اور انجمن حمایت اسلام محمد حنیف شاہد کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور جولائی ۱۹۷۶ء
سرگذشت ازعبدالسلام خورشید اقبال اکادمی پاکستان لاہور طبع اول ۱۹۷۷ء
اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ: لاہور بار اول اپریل ۱۹۷۵ء
گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور چاپ اول جنوری ۱۹۶۹ء
اقبال، شخصیت اور شاعری از رشید احمد صدیقی اقبال اکادمی پاکستان نومبر ۱۹۷۷ء
آندھی میں چراغ از خواجہ غلام السیدین
علامہ اقبال بھوپال میں ازعبدالقوی دسنوی شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال ۱۹۶۷ء
اقبال اور حیدرآباد از نظیر حیدرآبادی اقبال اکیڈمی پاکستان اپریل ۱۹۶۱ء
اقبال اور کشمیر از پروفیسر جگن ناتھ آزاد علی محمد اینڈ سنز سرینگر پہلا اڈیشن ۱۹۷۷ء
اقبال اور دہلی ازعبدالقوی دسنوی نئی آواز جامعہ نگر دہلی ۱۹۷۸ء
سفرنامہ اقبال از محمد حمزہ فاروقی مکتبہ معیار کراچی اشاعت اول ۱۹۷۳ء

خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی ترجمہ ڈاکٹر منظر عباس نقوی شعبہ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۴ء
اکبر و اقبال از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار مکتبہ عالیہ لاہور بار اوّل ۱۹۷۷ء
روح مکاتیب اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی اقبال اکادمی پاکستان لاہور طبع اول نومبر ۱۹۷۷ء
خطوط اکبر مرتبہ خواجہ حسن نظامی
اقبال کے صفیر از۔ ایس۔ ام۔ ناز
عظمت رفتہ از ضیاء احمد برنی
اقبال انیسویں صدی میں از عبدالقوی دسنوی: نسیم بک ڈپو لکھنؤ بار اوّل اکتوبر ۱۹۷۷ء
اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں مرتبہ گوپی چند نارنگ: مکتبہ جامعہ نئی دہلی پہلی بار فروری ۱۹۷۹ء
سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی ہمالیہ بک ہاؤس دہلی: بار اول فروری ۱۹۷۴ء

رسائل

اقبال کی تاریخ ولادت از مالک رام تحریر سہ ماہی دہلی جولائی ستمبر ۱۹۷۵ء
علامہ اقبال کی تاریخ ولادت کیا ہے از ڈاکٹر نذیر صوفی تحریر سہ ماہی دہلی جولائی ستمبر ۱۹۷۵ء
ڈاکٹر سر محمد اقبال: منشی محمد دین فوق: اقبال نمبر: ستمبر اکتوبر نیرنگ خیال لاہور ۱۹۳۲ء
علامہ اقبال کے استاد: شیخ آفتاب احمد نیرنگ خیال لاہور اقبال نمبر ستمبر اکتوبر ۱۹۳۲ء
باقیاتِ اقبال از قاضی افضل حق قرشی اردو کراچی شمارہ ۳ ۱۹۳۲ء
اکبر اور اقبال از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صحیفہ اقبال نمبر سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۶۶ء
اقبال اور جامعہ از عبداللطیف اعظمی: جامعہ دہلی جنوری، مارچ ۱۹۷۸ء
علامہ اقبال کے سفر کی روداد اور خطبات از محمد عالم مختار حق نقوش اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء
خطوط نمبر حصہ دوم نقوش لاہور مرتبہ محمد طفیل
شخصیات نمبر نقوش لاہور مرتبہ محمد طفیل
مثنوی اسرار خودی از محمد اسلم جیراجپوری:
نذر اقبال: افکار کراچی دسمبر ۱۹۷۷ء

سر اقبال اپنے گھر میں از سلمیٰ صدیقی : قومی راج بمبئی اقبال صدی خصوصی نمبر ۲۵ دسمبر ۱۹۷۷ء

اقبال، حالی اور ہریانہ از خواجہ احمد عباس تعمیر ہریانہ (ماہنامہ فروری ۱۹۷۸ء

دوسری مطبوعات

ایک اور مشرقی کتب خانہ	۱۹۵۴ء
حسرت کی سیاسی زندگی	۱۹۵۶ء
اور ہندستان جاگ اٹھا	۱۹۶۳ء
علامہ اقبال بھوپال میں	۱۹۶۷ء
مضامین لسان الصدق	۱۹۶۷ء
غالبیات	۱۹۶۹ء
بھوپال اور غالب	۱۹۷۰ء
نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی	۱۷
قادر نامہ غالب	۱۹۷۱ء
ایک شہر پانچ مشاہیر	۱۹۷۳ء
انیس نما	۱۹۷۴ء
مطالعۂ خطوط غالب	۱۹۷۵ء
سات تحریریں	۱۹۷۵ء
تلاش و تاثر	۱۹۷۶ء
ہندستان میں اقبالیات	۱۹۷۶ء
مہدی حسن افادی	۱۹۷۷ء
مرزا سلامت علی دبیر (مرزا دبیر نمبر: کتاب نما دہلی)	۱۹۷۷ء
اقبال اُنیسویں صدی میں	۱۹۷۷ء
بچوں کا اقبال	۱۹۷۸ء
اقبال اور دلی	۱۹۷۸ء
مطالعۂ خطوطِ غالب (مع اضافہ)	۱۹۷۹ء
مکاتیب عبدالحق بنام محوی	۱۹۸۰ء
مطالعۂ غبار خاطر	۱۹۸۱ء
نذر تخلص	۱۹۸۱ء
دھنپت رائے، نواب رائے، پریم چند	۱۹۸۱ء
اقبال اور دار الاقبال بھوپال	۱۹۸۳ء

کتبہ:- ممتاز احمد بستوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم مطبوعات

غبارِ کارواں	(سوانح)	بیگم انیس قدوائی مرتبہ: پروفیسر انور صدیقی	۲۷/=
شعر چیزے دیگر است	(ادبی)	عتیق حنفی	۲۷/=
خطباتِ عیدین	(خطبات)	محمد نقی امینی	۲۱/=
بچوں کا آرٹ	(آرٹ)	عبید الحق	۲۷/=
ادبی سماجیات	(ادبی)	ڈاکٹر محمد حسن	۲۱/=
الفاظ کا مزاج	(ادبی)	غلام ربانی مرحوم	۲۱/=
کلیاتِ عرش ملسیانی	(کلیات)	مرتبہ: مالک رام	۷۵/=
کہانی کے پانچ رنگ	(ادبی)	شمیم حنفی	۲۴/=
تعلیم، نظریہ اور عمل	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/=
علامتوں کا زوال	(ادبی)	انتظار حسین	۳۶/=
شعورِ ادب	(انتخاب نثر و نظم)	مرتبہ: ادارہ	۱۸/=
برکت ایک چینک کی	(مزاحیہ مضامین)	وجاہت علی سندیلوی	۱۵/=
عالم پناہ	(ناول)	رفیعہ منظور الامین	۳۰/=
اداس موٹر	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۱۲/=
پہلو بہ پہلو	(افسانے)	شہاب عظیم آبادی	۱۲/=
نیلی ساری	(افسانے)	خواجہ احمد عباس	۱۲/=
مکتی بودھ	(افسانے)	راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
حضرت جنید بغدادیؒ	(تصوف)	ضیاء الحسن فاروقی	۳۵/=
تقریر و تحبیر	(تقاریر)	محمد ہدایت اللہ	۱۵/=
فراق، شخص و شاعر	(ادبی)	مرتبہ: شمیم حنفی	۳۵/=
معاصر ادب کے پیش رو	(تنقیدی)	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/=
ذکرِ خیر	(خاکے)	یوسف ناظم	۱۸/=
نشریات آل انڈیا ریڈیو	(معلومات)	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۰/=
دیوارِ قہقہہ	(شعری مجموعہ)	محمد یوسف پاپا	۱۵/=
کہاوت اور کہانی	(کہاوت)	سیفی پریمی	۶/=
ہمارے محاورے	(محاورے)	سیفی پریمی	۷/۵۰
لمحوں میں بکھری زندگی	(ناول)	کشمیری لال ذاکر	۱۸/=
مہکتی بہاریں	(ناول)	کوثر چاند پوری	۱۸/۵۰
مثنوی بحر المحبت	(مثنوی)	مرتبہ: عبد الماجد دریابادی	۵/=

نیو آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی